امام جعفر صادق علیہ السلام

اور

سائنسی انکشافات

امام جعفر صادق علیہ السلام

اور

سائنسی انکشافات

۲۵ عالمی دانشوروں کی تحقیقات کا مجموعہ

ناشر

مؤسسۂ اہلبیتِ پاکستان

نام کتاب — امام جعفر صادقؑ اور سائنسی انکشافات

اثر — ۲۵ بین الاقوامی دانشور

ترجمہ — مولانا سید محمد باقر جوراسی

تصحیح و ترتیب — سید محمد علی اجہدی

ناشر — موسسہ اہلِ بیتؑ

تعاون — سازمانِ تبلیغاتِ اسلامی ایران

تاریخِ اشاعت — ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ - اپریل ۱۹۹۴ء

تعداد — ۲۰۰۰

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب جو "امام جعفر صادقؑ مغز متفکر جہانِ شیعہ" کے نام سے مختلف زبانوں میں طبع ہو کر کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ اصل میں یورپ کی ترقی یافتہ دنیا کے سائنسدانوں اور دانشوروں کی اپنے معیارات اور نقطہء نظر کے مطابق علمی کاوشوں اور موشگافیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ نتائج جن پر ان یورپی دانشوروں نے رسائی حاصل کی ہے دراصل وارثِ پیغمبرِ اکرمؐ، مذہبِ اہلِ بیتؑ کے موسس و بانی، الٰہی سلسلہء خلافت و امامت کے چھٹے تاجدار اور اسلامی شاہراہِ ہدایت کے روشن منارے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منسوب ہیں۔

بہر حال ایک تو اس سے قبل ان مسائل پر اسلامی طریقہء استدلال سے تحقیق و تدقیق نہیں ہوئی ہے اور دوسرے جن افراد اور دانشوروں نے ان علمی انکشافات کو جمع کیا ہے وہ طبیعی علوم کے علاوہ ماوراء طبیعی علوم پر کوئی توجہ نہیں رکھتے، نہ انہیں ان علوم سے کوئی آگاہی یا آشنائی ہی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر انسان فطرتاً شعوری یا لاشعوری طور سے اس جانی بوجھی یا انجانی راہ پر گامزن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان دانشوروں نے انبیاء کرامؑ اور ائمہء اطہارؑ کے علوم و معارف کو اکتسابی بشری استعداد اور انسانی قوتِ فکر کے آئینہ میں دیکھا اور جب انسانی اندازے اور بشری طاقتِ فکر تھک کر جواب دے گی تو یہ لوگ توجیہ و تاویل یا مدرک و سند کی تلاش میں گئے کہ یہ کس کے اقوال اور کس کی کہی ہوئی باتیں ہیں؟ لیکن جو لوگ دنیا و مافیہا کو

الٰہی اسرار اور تخلیقِ کردگار کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور انبیاء و ائمہ علیہم السلام نیز علمائے کرام کے علوم کو طبیعت اور ماوراء طبیعت کے حقائق تک پہنچنے کا وسیلہ و ذریعہ قرار دیتے ہیں وہ تمام علوم کی پیشرفت' نئے نئے انکشافات غرض کہ ہر طرح کی ظاہری علمی ترقی سے پہلے الٰہی علوم کے وارث انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے اقوال و ارشادات کو ہدایت کا سرچشمہ اور خالقِ علم و نور سے مربوط جانتے ہیں اس طرح وہ لامتناہی معیاروں اور اندازوں کو بشری اندازوں سے نہیں ناپتے۔

اس کے باوجود امتِ اسلامی کو ان یورپی دانشوروں کا شکرگزار ہونا چاہئے جو دراصل ہر تحقیق و انکشاف کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور جنہوں نے آج کی دنیا میں انسانی حقوق' آزادیٔ بشر اور آزادیٔ قلم کو اپنے منافع و مفادات سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے علوم و معارفِ اہلِ بیت علیہم السلام سے کسی حد تک آگاہی حاصل کرنے اور الٰہی علوم کے حقیقی وارثوں کی صحیح معرفت حاصل کرنے کے لئے ترقی یافتہ دنیا کے روبرو ایک روشن و منور راہ کھول دی ہے۔ امتِ اسلامی کے لئے بھی یہ بات لائقِ غور و فکر ہے کہ اجنبی اقوام ان کی علمی میراث کو یوں اجاگر کر رہی ہیں جبکہ ان کے پاس صحیح اور غیر صحیح کو ناپنے والے درست اندازے بھی نہیں اور ہم ابھی "قال۔اقول" کی بھول بھلیوں میں ہی گم ہیں۔

غرض کتابِ ہذا جو ہمارے محترم قارئین کے ہاتھوں میں ہے اور ہم انہیں اس کے مطالعہ کی دعوت دے رہے ہیں یہ یورپ اور امریکہ کے چند دانشوروں کی اپنے لحاظ سے علمی کاوشوں اور محنتوں کا ثمرہ و نتیجہ ہے اس اعتبار سے اسے اسلامی نقطہ نظر سے بالکل ہم آہنگ اور آخری نظریہ و نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جو امت بابِ اجتہاد کے وا ہونے کی قائل ہے اور اپنے اوپر تحقیق کے دروازے بند نہیں کرتی وہ اس کاوش کو بھی صحت مند دماغوں اور صائبِ فکر پڑھنے والوں کے حوالے کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہے۔

ناشر

عناصرِ اربعہ کے عقیدے سے پہلا اختلاف

امام محمد باقر علیہ السلام کی درس گاہ میں جن علوم کا درس دیا جاتا تھا ان میں علمِ طبیعیات بھی شامل تھا۔ اگرچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے علمِ طب کی بنیادوں پر ہماری زیادہ نظر نہیں ہے۔ لیکن علمِ طبیعیات کے بارے میں ان کی مہارت سے ہم زیادہ واقف ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے یہاں ارسطو کا علمِ طبیعیات پڑھایا جاتا تھا اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ارسطو کی طبیعیات میں کئی علوم شامل تھے۔ آج علمِ حیوانات' علمِ نباتات اور علمِ جمادات کو طبیعیات کا جزو نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان میں سے ہر ایک جداگانہ علم ہے لیکن ارسطو کی طبیعیات میں ان علوم کے بارے میں بھی بحث کی گئی ہے جس طرح "میکانیات" (MECHANICS) ارسطو کی طبیعیات میں داخل ہو گیا۔

اگر ہم طبیعیات کا مفہوم علم الاشیاء قرار دیں تو ارسطو کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ مندرجہ بالا مباحث کو علمِ طبیعیات میں شامل کرلے کیونکہ یہ ساری بحثیں علم الاشیاء پر مشتمل ہیں۔

(بقول مستشرقین) احتمال یہ ہے کہ ارسطو کی طبیعیات بھی اسی ذریعہ سے امام محمد باقر علیہ السلام کی درس گاہ تک پہنچی جیسے علمِ جغرافیہ اور علمِ ہندسہ پہنچا تھا یعنی مصر کے قبطیوں کے ذریعے سے۔ فرید وجدی صاحب دائرۃ المعارف لکھتے ہیں کہ علمِ طب' کتبِ

اسکندریہ کے ذریعے امام جعفر صادقؑ تک پہنچا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ جب امام جعفر صادقؑ تحصیلِ علوم کر رہے تھے اس وقت اسکندریہ کا علمی مکتب موجود نہیں تھا جس سے یہ علم آپؑ تک پہنچتا۔

اسکندریہ کا یہ علمی مکتب اس کتب خانے سے وابستہ ہے جو مصر پر عربوں کے تصرف کے بعد تلف ہو گیا تھا۔ جن لوگوں نے اس کتب خانے کی کتابوں سے نقلیں حاصل کی تھیں شاید ان کے پاس کچھ نسخے موجود رہے ہوں لیکن وہاں کا علمی مکتب کتب خانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا' البتہ جن لوگوں نے اسکندریہ کے مکتبِ علمی میں تربیت پائی تھی۔ انہوں نے اس کے نظریات کو بالخصوص فلسفۂ افلاطونِ جدید کو اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو سکھایا جن سے نسل در نسل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا۔

اس بات کا احتمال ہے کہ ایک یا چند کتابیں جو کتب خانۂ اسکندریہ سے نقل کی گئی تھیں مصر سے امام جعفر صادقؑ تک پہنچ گئی ہوں اور فرید وجدی کی مراد مکتبِ اسکندریہ سے وہ مکتب نہ ہو جس کا سرچشمہ اس کا کتب خانہ تھا بلکہ وہ کہنا چاہتا ہو کہ "وہ کتاب یا کتابیں جو مکتبِ اسکندریہ کی یادگار کہی جا سکتی ہوں امام جعفر صادقؑ تک پہنچ گئی ہوں۔"

غرضیکہ امام جعفر صادقؑ اپنے والدِ گرامی کے زیرِ تربیت علمِ طبیعیات (Physics) سے آشنا ہوئے اور جس طرح علمِ جغرافیہ میں زمین کے گرد آفتاب کی گردش کا نظریہ باطل کیا' ارسطو کے علمِ طبیعیات کے کچھ حصّوں کو بھی رد کیا جب کہ ابھی ان کا سِن بارہ سال کو بھی نہیں پہنچا تھا۔

ایک روز اپنے والد اور استاد یعنی امام محمد باقرؑ کے روبرو ارسطو کی طبیعیات کے اس حصے پر پہنچے کہ دنیا میں چار عناصر سے زیادہ موجود نہیں ہیں یعنی پانی' ہوا' آگ اور مٹی۔ امام جعفر صادقؑ نے اعتراض کرتے ہوئے فرمایا مجھے حیرت ہے کہ ارسطو جیسا انسان اس چیز کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوا کہ خاک ایک عنصر نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہت سے عناصر موجود ہیں اور اس میں جتنے فلزات (دھاتیں) ہیں وہ سب ایک جداگانہ عنصر ہیں۔

ارسطو کے زمانے سے امام جعفر صادقؑ کے دور تک تقریباً ایک ہزار سال گزر چکے تھے اور اس طولانی مدت میں عناصرِ اربعہ جس طرح ارسطو نے بتایا تھا کہ علم الاشیاء کے ارکان میں شمار ہوتے تھے' کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا معتقد نہ ہو اور کسی کے دل میں اس نظریے سے اختلاف کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن ہزار سال کے بعد ایک بچہ جو ابھی بارہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا بتاتا ہے کہ خاک ایک عنصر نہیں بلکہ متعدد عناصر سے مل کر بنی ہے۔ اس نے جب خود درس دینا شروع کیا تو دوسرے عنصر کے بسیط (غیر مرکب) اور خالص ہونے کو بھی غلط بتایا اور کہا کہ ہوا ایک عنصر نہیں بلکہ چند عناصر پر مشتمل ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اٹھارویں صدی عیسوی کے علمائے یورپ سے گیارہ سو سال قبل اجزائے ہوا کی تشریح و تجزیہ کرتے ہوئے اس کو چند عناصر سے مخلوط بتایا۔

اگر کچھ لوگ غور و فکر کے بعد یہ مان بھی لیتے تھے کہ خاک ایک عنصر نہیں ہے بلکہ اس میں کئی عناصر ہیں تو اس میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ ہوا کا عنصر ایک ہی ہے۔ ارسطو کے بعد دنیا کے بڑے سے بڑے علماءِ طبیعیات بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ ہوا عنصرِ بسیط نہیں ہے یہاں تک کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں بھی جو علم کا ایک درخشندہ دور تھا' لوازیہ کے دور تک بہت سے علماء ہوا کو عنصرِ بسیط سمجھتے تھے اور اس حقیقت پر غور نہیں کرتے تھے کہ یہ چند عناصر سے مخلوط ہے لیکن جب لوازیہ نے آکسیجن کو ہوا کے دوسرے بخارات سے علیحدہ کیا اور وضاحت کی کہ سانس لینے اور جلنے میں آکسیجن کتنا بڑا کام کرتی ہے تو عام طور پر علماء نے تسلیم کیا کہ ہوا بسیط نہیں بلکہ چند بخارات سے مرکب ہے۔ بالآخر ۱۷۹۴ء میں اس جرم کی سزا میں اس کا سر تن سے جدا کر کے جدید علمِ طبیعیات کے باپ کو اس دنیا سے رخصت کر دیا گیا جو اگر زندہ رہتا تو شاید دوسرے انکشافات بھی سامنے آتے۔

(اس مقام پر مستشرقین نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اب سے گیارہ سو سال قبل یہ اور اسی قبیل کی دوسری علمی باتیں بتانے کی وجہ سے شیعہ کہتے ہیں کہ امام جعفر

صادق علیہ السلام کو علمِ لدنی اور علمِ امامت کے ذریعے یہ معلومات حاصل تھیں۔ لیکن ایک مورخ کہتا ہے کہ اگر ایسا تھا تو انہوں نے مادے کو انرجی سے بدلنے کا قانون کیوں بیان نہیں کیا جسے اس صدی میں آئن اسٹائن نے معلوم کیا؟ کیونکہ علمِ امامت رکھنے والے کو ہر چیز جاننا چاہئے لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ بشری علم تھا۔ (حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی اس لئے کہ یہ ضروری نہیں کہ عالم یا معلم جو کچھ جانتا ہو سب بیان ہی کردے جیسا موقع یا جیسا سوال ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے بیان اور جواب ہوتا ہے۔ ع "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد" اس کے علاوہ اگر کوئی بات ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ آپ نے اسے کسی سے بیان ہی نہیں فرمایا۔ یہ لازم نہیں ہے کہ آپ کی ایک ایک بات کتابوں میں محفوظ کرلی گئی ہو۔ محمد باقر مترجم اردو)

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ: "ہوا کے اندر کئی اجزاء موجود ہیں اور یہ سب سانس لینے کے لئے ضروری ہیں۔" جب لاوازیہ نے آکسیجن کو ہوا کی دوسری گیسوں سے الگ کیا اور وضاحت کی کہ آکسیجن ہی جانداروں کی زندگی کا ذریعہ ہے۔ تو ماہرین نے ہوا میں شامل دوسری گیسوں کو زندگی کے لئے غیر مفید قرار دیا اور یہ نظریہ امام جعفر صادقؑ کے اس نظریے کا مخالف تھا کہ ہوا میں جتنے اجزاء ہیں وہ سب سانس لینے کے لئے ضروری ہیں۔

لیکن ان علماء نے انیسویں صدی کے نصف میں آکسیجن کے بارے میں اپنے اس نظریے کی تصحیح کی کیونکہ یہ ثابت ہوگیا کہ آکسیجن اگرچہ تمام جانداروں کا سرمایہء زندگی ہے اور ہوا کی ساری گیسوں میں یہی وہ تنہا گیس ہے جو جسم کے اندر خون کو صاف کرتی ہے لیکن کوئی جاندار ایک مدت تک صرف آکسیجن سے سانس نہیں لے سکتا کیونکہ اس کے آلاتِ تنفس کے خلیے اس سے مرکب ہو کر جل جائیں گے۔ آکسیجن خود نہیں جلتی لیکن جلانے میں مدد دیتی ہے۔ اور جب کسی ایسے جسم کے ساتھ شامل ہو جائے جو جلنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ جل جاتا ہے چنانچہ جب انسان یا دیگر حیوانات

کے پھیپھڑے ایک مدت تک خالص آکسیجن کی سانس لیں گے تو چونکہ یہ ان کے خلیوں سے مرکب ہو جائے گی لہٰذا وہ جل جائیں گے۔ اور جس انسان یا جانور کا پھیپھڑا جل جائے تو وہ مرجاتا ہے۔ اس بنا پر لازمی ہے کہ ہوا میں آکسیجن کے ساتھ دوسری گیسیں بھی پھیپھڑوں میں پہنچیں تاکہ ایک طولانی مدت تک آکسیجن کے اثر سے جلنے نہ پائیں۔

جب ان علماء نے سانس کے سلسلے میں آکسیجن کے متعلق اپنے نظریے کو درست کیا تو معلوم ہوا کہ امام جعفر صادقؑ کا نظریہ صحیح ہے اور ہوا کے اندر جتنی گیسیں موجود ہیں وہ سانس کے لیے مفید ہیں مثلاً "اوزون" گیس جس کے فطری خواص آکسیجن ہی کے مانند ہوتے ہیں اور اس کا ہر مالیکیول (یعنی مادے کا سب سے چھوٹا جزو) آکسیجن کے تین ایٹم سے وجود میں آیا ہے بظاہر تنفس میں کوئی عمل نہیں رکھتی ہے حالانکہ یہ آکسیجن کو خون میں داخل ہونے کے وقت صحیح حالت پر قائم رکھتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب آکسیجن خون میں پہنچتی ہے تو یہ اس کی نگرانی کرتی ہے کہ آکسیجن اپنے کام سے سبکدوش نہ ہونے پائے یہی سبب ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے اس نظریے کی کہ "ہوا کے جملہ اجزاء سانس کے لئے ضروری ہیں" انیسویں صدی کے نصف سے اب تک تائید کی جارہی ہے۔

ہوا میں جو گیسیں موجود ہیں ان کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ آکسیجن کو تہ نشین نہیں ہونے دیتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آکسیجن فضا میں مرکب صورت میں نہیں ہے بلکہ ہوا کے ساتھ مخلوط ہے اور چونکہ یہ ہوا سے زیادہ وزنی ہے لہٰذا قاعدے کے لحاظ سے اسے تہ نشین ہوجانا چاہئے لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو زمین کی سطح ایک معین بلندی تک آکسیجن سے ڈھک جاتی اور جو دوسری گیسیں ہوا کے اندر ہیں وہ اس کے اوپر اپنی جگہ بناتیں، نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام جانداروں کے آلاتِ تنفس جل جاتے اور ان کی نسلیں ختم ہو جاتیں۔

دوسرے یہ کہ گھاس بھی نمو نہ پاتی کیونکہ اگرچہ گھاس بھی جاندار کے مانند زندہ

رہنے کے لئے آکسیجن کی محتاج ہے لیکن ساتھ ہی کاربن کی احتیاج بھی رکھتی ہے لہٰذا اگر سطح زمین ایک خاص بلندی تک آکسیجن سے ڈھک جاتی تو کاربن زمین تک نہ پہنچتی اور گھاس نہ اگتی چنانچہ جو گیسیں ہوا میں شامل ہیں وہ آکسیجن کو تہ نشین ہونے سے روکتی ہیں تاکہ حیوانات اور نباتات کی زندگی ختم نہ ہو۔ امام جعفر صادقؑ پہلے انسان ہیں جنہوں نے عناصرِ اربعہ کے عقیدے کو جو ایک ہزار سال سے مسلّم تھا متزلزل کر دیا اور وہ بھی ایسی عمر میں جب کہ آپ نوجوانی کی حد میں بھی نہیں پہنچے تھے البتہ ہوا کے نظریے کو اس وقت زبان پر لائے جب آپ سنِ رشد کو پہنچے اور درس دینا شروع کیا۔

آج یہ موضوع ہماری نظر میں معمولی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری دنیا میں ایک سو دو عناصر موجود ہیں۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی اور پہلی صدی ہجری میں یہ ایک بہت بڑا انقلابی نظریہ تھا اور اس صدی میں انسانی عقل یہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ ہوا ایک خالص اور بسیط (غیر مرکب) عنصر ہے۔ ہم پھر کہتے ہیں اس دور میں اور اس کے بعد کے زمانوں میں اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ اس علمی اور انقلابی عقیدے نیز ان دوسری چیزوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا جنہیں امام جعفر صادقؑ نے بیان فرمایا اور جن کا آئندہ فصلوں میں ذکر کیا جائے گا۔ البتہ مشرقی ممالک اور مدینے جیسے شہر میں جو پیغمبرِ اسلامؐ کا شہر تھا ایسے علمی نظریات کو بغیر اس خوف کے زبان پر لایا جا سکتا تھا کہ کہنے والے پر کفر کا الزام عائد کر دیا جائے گا۔

اگرچہ دینِ اسلام کے اندر یہ کہنے والے پر کہ ہوا بسیط نہیں ہے کفر کی تہمت نہیں لگتی تھی۔ لیکن بعض قدیم مذاہب میں ایسا قول کفر کی دلیل سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ہوا کی طہارت کے قائل تھے اور یہ طہارت اس کے بسیط ہونے پر مبنی تھی جیسے پانی کی طہارت بھی ان کے نزدیک اس کے بسیط ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔ جس وقت ہم علمِ طبیعیات کی تاریخ پڑھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ جوزف پرسٹلی نے جو انگلینڈ کا باشندہ تھا (۱۷۳۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گیا۔) آکسیجن کا انکشاف کیا لیکن اس کی خصوصیات کا پتہ نہیں لگا سکا۔ اس کی خصوصیات کو پہچاننے اور پہچنوانے والا لاوازیہ

تھا۔

اس علم کی تاریخ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ آکسیجن کا نام بھی پرسٹلی ہی کا وضع کیا ہوا ہے درحالیکہ اس کا مفہوم پرسٹلی سے پہلے موجود تھا۔ آکسیجن ایک یونانی لفظ ہے جس کے دو جزو ہیں پہلے جزو کے معنی ترشی کے ہیں اور دوسرے جزو کے معنی ہیں پیدا کرنے والا' لہٰذا آکسیجن کے معنی ہوئے ترشی پیدا کرنے والا۔ آکسیجن کا نام ہو سکتا ہے کہ پرسٹلی ہی نے وضع کیا ہو لیکن ترشی پیدا کرنے والے کا مفہوم پہلے سے موجود تھا۔ ہم پرسٹلی کا درجہ گھٹانا نہیں چاہتے کیونکہ یہ روحانی انسان جو پادری کا لباس اتار کے کلیسا سے تجربہ گاہ میں پہنچا اور آکسیجن کا انکشاف کیا ایک نمایاں علمی حیثیت کا مالک تھا۔ اگر یہ سیاست میں داخل نہ ہوتا تو شاید آکسیجن پر اپنی تحقیق جاری رکھ سکتا اور اسے اندازہ ہوتا کہ اس نے کتنا بڑا انکشاف کیا ہے لیکن سیاست نے اسے تجربہ گاہ سے دور کر دیا اور یہ انگلستان میں فرانس کے انقلابیوں کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی ایسی شدید نفرت کا نشانہ بن گیا کہ اپنے وطن میں نہ ٹھہر سکا اور امریکہ ہجرت کر گیا۔ وہاں اس نے چند کتابیں شائع کیں لیکن ان میں سے کوئی آکسیجن کے بارے میں نہ تھی۔ سب سے پہلا انسان جس نے یہ معلوم کیا کہ آکسیجن ترشی پیدا کرنے والی چیز ہے' امام جعفر صادقؑ ہیں۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے اپنے والد کی درس گاہ میں یہ بات سیکھی تھی کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ جب انہوں نے خود درس دینا شروع کیا تب فرمایا کہ ہوا ایک بسیط عنصر نہیں ہے اور قوی احتمال یہی ہے کہ انہوں نے اسی موقع پر یہ استنباط کیا ہو۔ شبہ دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ "مولد الحموضہ" (یعنی ترشی پیدا کرنے والی) کا نام ان کی زبان پر نہیں آیا تھا البتہ انہوں نے اپنے درس میں فرمایا کہ ہوا چند اجزاء پر مشتمل ہے اور ان میں سے ایک جزو بعض اجسام میں داخل ہو کر اسے متغیر کر دیتا ہے اور ہوا کا یہی جزو جلنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر اس کی مدد نہ ہو تو جلنے کے قابل چیزیں بھی نہیں جلتیں۔

اس نظریے کو خود امام جعفر صادقؑ نے وسعت دی اور پھر اپنی تعلیمات میں فرمایا کہ ہوا میں جو چیز اجسام کو جلانے میں معاون ہوتی ہے وہ اگر ہوا سے الگ ہو جائے اور خالص طور پر ہاتھ آجائے تو اس میں جلانے کی اتنی طاقت ہو گی کہ اس سے لوہا بھی جلایا جاسکتا ہے اس بنا پر پرسٹلی سے ایک ہزار سال قبل اور لاوازیہ سے پہلے امام جعفر صادقؑ نے آکسیجن کی بخوبی تعریف و توصیف کی اور فقط اس کا نام آکسیجن یا مولد الحموضہ نہیں رکھا۔

پرسٹلی نے باوجودیکہ آکسیجن کا انکشاف کیا لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ لوہے کو جلا دیتی ہے لاوازیہ نے باوجودیکہ آکسیجن کے کچھ خواص اپنے تجربے سے دریافت کئے لیکن وہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ گیس لوہے کو جلا دیتی ہے البتہ امام جعفر صادقؑ ایک ہزار سال قبل ہی اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے۔

آج ہم جانتے ہیں کہ اگر لوہے کا کوئی ٹکڑا اتنا گرم کیا جائے کہ سرخ ہو جائے اور اس کے بعد اسے خالص آکسیجن میں ڈبو دیا جائے تو تیز روشنی کا شعلہ دے کر جلنے لگے گا جس طرح کڑوے تیل یا مٹی کے تیل کے چراغ کو دیتے ہیں اور ان کی روشنی سے کام لیا جاتا ہے ایک ایسا چراغ بھی بنایا جا سکتا ہے جس کی بتی لوہے کی ہو اسے سیال آکسیجن میں ڈبو دیا جائے اور اسے اتنی حرارت پہنچائی جائے کہ سرخ ہوجائے تو یہ بتی بہت تیز روشنی کے ساتھ جلنے لگے گی۔

روایت میں ہے کہ ایک دن امام جعفر صادقؑ کے والد امام محمد باقرؑ نے اپنے درس میں فرمایا کہ علم کی مدد سے پانی کے ذریعے جو آگ کو بجھانے والا ہے آگ روشن کی جا سکتی ہے یہ قول اگر بظاہر کوئی شاعرانہ تعبیر معلوم نہ ہوتا ہو تو بے معنی ضرور سمجھا جاتا تھا اور جو لوگ اس روایت کو سنتے تھے ایک مدت تک یہی سوچتے رہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک شاعرانہ استعارہ بیان فرمایا ہے لیکن اٹھارویں صدی عیسوی کے بعد ثابت ہوا کہ علم کی مدد سے پانی کے ذریعے آگ جلائی جا سکتی ہے اور آگ بھی ایسی جو لکڑی یا کوئلے کی آگ سے کہیں زیادہ گرم ہو گی کیونکہ پانی کے دو میں سے ایک جزو

ہائیڈروجن کے آکسیجن کے ساتھ جلنے کی حرارت ۲۲۲۴ ڈگری تک پہنچ جاتی ہے اور آکسیجن کے ساتھ ہائیڈروجن کو جلانے کے عمل کو آکسیڈروجن کہتے ہیں جو دھاتوں کو جوش دینے یا ان کے ٹکڑوں کو توڑنے کی صنعت میں بہت ہی کار آمد ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ نے جب یہ کہا کہ علم کے ذریعے پانی سے آگ جلائی جا سکتی ہے تو آپ نے ہائیڈروجن کا انکشاف نہیں کیا تھا اور ہمارے پاس اس بات کی بھی کوئی سند نہیں ہے کہ ان کے فرزند امام جعفر صادقؑ نے خالص حیثیت میں اس کو دریافت کیا تھا اسی طرح اس کی بھی کوئی سند نہیں ملتی کہ آپ نے خالص آکسیجن کا انکشاف کیا' لیکن بلاشبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے غیر خالص طور پر آکسیجن کو دریافت کیا اور اس کی دلیل آپ کے وہ کام ہیں جو علمِ کیمیا سے متعلق ہیں۔

آپ کے ان کاموں کا ایک حصہ آکسیجن کی مدد سے انجام پذیر ہوا اور بغیر اس عنصر کی مداخلت کے آپ ان کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا آپ نے آکسیجن تیار کی البتہ خالص نہیں بلکہ دوسرے عناصر کے ساتھ مرکب صورت میں۔ امام جعفر صادقؑ نے جو نتائج برآمد کئے وہ تھیوری کی حیثیت سے نہیں تھے بلکہ انہیں میں سے یہ دو فارمولے بھی ہیں جو آپ نے وضع کئے۔

اوّل یہ کہ تنفس کے لحاظ سے ہوا کا ایک جزو دیگر اجزاء سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہ جزو ہوائے حیاتی ہے دوسرے یہ کہ اسی جزو کے سبب زمانہ گزرنے سے اشیاء زیادہ تر بالواسطہ متغیر یا فاسد ہوتی ہیں۔ اس "زیادہ تر بالواسطہ" کے مفہوم کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ امام جعفر صادقؑ آکسیجن کی کیفیت کے بارے میں کتنا تحقیق اور صائب نظریہ رکھتے تھے۔ انگلستان کے پرسٹلی کے بعد جب فرانس کے لاوازیہ نے آکسیجن کے بارے میں تحقیق کی اور اس کے اثرات کی جانچ کی تو صاحبانِ علم و دانش قائل ہوئے کہ اجسام کا تغیر زمانے کے گزرنے سے اور ان میں سے کسی کسی کا فاسد ہوجانا آکسیجن کی وجہ سے ہے یہاں تک کہ فرانس کے پاسٹور نے میکروب کا انکشاف کیا اور کہا کہ بعض چیزوں کا فاسد ہونا (مثلاً غذائی اشیاء کا مدّت گزرنے پر

خراب ہونا) عام خیال کے برخلاف آکسیجن کی وجہ سے نہیں بلکہ میکروب کے سبب سے ہے۔ میکروب مردہ جانوروں کے جسموں اور غذاؤں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور انہیں فاسد کر دیتے ہیں لیکن پاسٹور کو اس بات پر توجہ کرنا چاہیے تھی کہ میکروب بغیر آکسیجن کے زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ آکسیجن ہی ان کی زندگی کی محافظ ہے لہٰذا جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے ـــ آکسیجن اشیاء کے تغیر میں زیادہ تر بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہے اور کبھی بلاواسطہ بھی چیزوں کو متغیر کرتی ہے اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب یہ براہ راست دھاتوں کے ساتھ مرکب ہو جاتی ہے۔ اور علم کیمیا کی اصطلاح میں اس عمل کو (OXIDATION) کہتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کی طرف سے ایک ایسے باریک اور دقیق نظریے کا اظہار بغیر عملی تجربات کے ممکن نہیں تھا لیکن زمانہ اس کا موقع نہیں دے رہا تھا کہ آپ آکسیجن کی تحقیق و شناخت میں ان مراحل سے گزریں البتہ آپ نے اپنے فہم و فراست سے معلوم کر لیا تھا کہ ہوا کا جو حصہ تنفس کا اصلی عامل ہے اور جو اشیاء کو متغیر کرتا ہے سنگین بھی ہے اور باقی نوعِ بشر کو مزید ایک ہزار سال تک صبر کرنے کی ضرورت تھی یہاں تک کہ لاوازیہ یہ بتائے کہ آکسیجن کا وزن پانی کے نو حصوں میں سے آٹھ حصے ہوتا ہے۔ اور ہر نو کلوگرام پانی میں آٹھ کلوگرام وزن کی آکسیجن ہوتی ہے۔ لیکن حجم کے لحاظ سے پانی میں ہائیڈروجن آکسیجن کی دوگنا ہوتی ہے۔

باوجودیکہ "لاوازیہ" نے آکسیجن کی تحقیقات میں اتنی پیش رفت کی لیکن اس گیس کو سیال نہیں بنا سکا وہ اس کوشش میں ضرور تھا کہ اس کو رقیق بنائے لیکن دو چیزیں اس کے مقصد میں حائل ہو گئیں۔

اوّل یہ کہ اس کے دور میں جو اٹھارویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ تھا۔ صنعت و حرفت میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا۔ دوسرے اسے اتنی مہلت ہی نہیں دی گئی کہ اپنا کام پورا کر سکتا۔ اور اس کی جان لے لی گئی۔ اس کے بعد ایک مدت تک ماہرین یہی کہتے رہے کہ آکسیجن کو سیال نہیں بنایا جا سکتا۔

یہاں تک کہ ٹیکنک نے اتنی ترقی پائی کہ بہت زیادہ ٹھنڈک کا وجود میں لانا ممکن ہوا پھر بھی بیسویں صدی عیسوی تک آکسیجن کو زیادہ مقدار میں یعنی اس صورت سے کہ وہ صنعت میں کار آمد ثابت ہو رقیق بنانے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ بیسویں صدی عیسوی میں شدید قسم کی ٹھنڈک پیدا کرنے کی ٹیکنک میں انیسویں صدی عیسوی سے زیادہ ترقی ہوئی اور درجہ حرارت صفر سے ۱۸۳ ڈگری نیچے گرا کے اضافی دباؤ کے بغیر معمولی ہوا کے دباؤ میں آکسیجن کو مائع کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔

آج یہ ممکن ہے کہ آکسیجن کو زیادہ مقدار میں مائع میں تبدیل کر کے صنعتوں میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے ۔ صفر سے ۱۸۳ ڈگری نیچے درجہ حرارت کو کم ٹھنڈا نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ مطلق ٹھنڈک سے جس کا دوسرا نام صفر مطلق ٹھنڈک ہے اس کا فاصلہ صرف ۹۰ ڈگری کا ہوتا ہے اور صفر مطلق ٹھنڈک ۱۶، ۲۷۳ ڈگری صفر سے نیچے ہوتی ہے۔ اس ٹھنڈک میں جیسا کہ ماہرین کہتے ہیں مادے کی اندرونی حرکت ساکت ہو جاتی ہے۔

بہرحال زمانے نے موقع نہیں دیا کہ امام جعفر صادقؑ ہوا کے جزوِ حیاتی اور مولد الحموضہ کے بارے میں جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے آگے بڑھیں لیکن آپ نے جس قدر دریافت کیا وہ آپ کو آکسیجن کی معلومات میں سب سے مقدّم قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ آپ طبیعیات کے اس شعبہ میں اپنے ہم عصروں سے ایک ہزار سال آگے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے آپ کے بعد کہا کہ ہوا اور آکسیجن کو مائع بنایا جا سکتا ہے لیکن آپ کے شاگردوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک کلّی نظریہ ہے اور زمانۂ قدیم بلکہ ارسطو سے قبل ہی اس کا پتا لگایا جا چکا تھا کہ ہر بخار یا گیس کو مائع بنایا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کا ذریعہ دستیاب نہیں تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ موجودہ علوم کا ایک حصہ قدیم زمانوں سے تھیوری کی شکل میں سامنے آ چکا تھا البتہ اسے عملی جامہ پہنانے کے وسائل موجود نہیں تھے یونان کے "دیمقراطیس" نے ولادتِ مسیح سے پانچ سو سال قبل ایٹم کی تھیوری اسی شکل میں بیان کی تھی جس طرح آج ہم

جانتے ہیں اور کہا تھا کہ مادہ ایٹموں سے بنا ہے اور ہر ایٹم کے اندر تیز اور سریع حرکتیں موجود ہیں۔ اگر ہم الیکٹران ...... پروٹان .... نیوٹران اور ایٹم کے دیگر اجزاء کے ناموں سے قطع نظر کریں جو انیسویں اور بیسویں صدی کے موضوعات ہیں تو دیمقراطیس نے تھیوری کی حیثیت سے ایٹم کی تعریف میں کوئی فروگذاشت نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود بنی نوع انسان اس صدی تک ایٹم سے عملی فائدہ حاصل نہ کرسکے اور اگر دوسری جنگِ عظیم پیش نہ آتی اور جرمنی کے سائنسداں ایٹم کی طاقت سے فائدہ اٹھانے کی فکر نہ کرتے اور امریکہ جرمنی کے خوف سے پیش قدمی کی کوشش نہ کرتا تو شاید اس صدی کے آخر تک بھی ایٹمی طاقت سے عملی استفادہ ممکن نہ ہوتا۔

امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے ہوا یا آکسیجن کو رقیق بنانے کے امکان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ صرف ایک تھیوری ہے جو پہلے سے موجود تھی لیکن آکسیجن کے سلسلے میں جو باتیں امام جعفر صادقؑ نے فرمائی ہیں وہ تھیوری کی حدود سے تجاوز کر کے اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ آپ کی آکسیجن شناسی عمل کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔

---☆---☆---

کیا جدید علمی دور کے موجد امام جعفر صادقؑ ہیں؟

ہم دیکھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد کے حلقۂ درس میں اس سوال کو اٹھایا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے جبکہ اسی حال میں بارہ برجوں کو عبور بھی کرتا ہے اور فرمایا کہ اس قسم کی رفتار عقل کے خلاف ہے ہم عنقریب دیکھیں گے کہ امام جعفر صادقؑ نے جو اپنے والد کے بعد مستقل طور پر درس دینے لگے تھے ستاروں کے بارے میں اسقدر نظریات کو رد فرمایا کہ اگر آپ کو تمام علوم کے اندر تجدّد کا پیشوا نہ مانا جائے تو اتنا کہنا ہی پڑے گا کہ آپ علمِ نجوم میں تجدّد کے پیشوا ہیں اور تجدّد سے ہماری مراد عصرِ جدید ہے جس میں علمی روشنی کا سرچشمہ یورپ میں ہے اور جس کا آغاز سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح سے خیال کیا جاتا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ علمی تجدّد کے لئے دنیائے اسلام یورپ سے زیادہ آمادہ تھی اور اسلام کی وسیع القلبی نے حقائق کو پہلے ہی قبول کرلیا تھا جب کہ یورپ پندرھویں صدی عیسوی میں جب قسطنطنیہ فتح ہوا اور اس کے بعد سولھویں صدی میں بلکہ سترھویں صدی تک انہیں برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ ان علمی حقائق میں جنہیں کم یا زیادہ سننے کا یورپ متحمل نہیں تھا علمِ نجوم کی حقیقتوں سے زیادہ اور کوئی چیز ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔

یورپ میں اگر کوئی شخص پانی، مٹی یا آگ وغیرہ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہتا تھا جو رسم و رواج کے خلاف ہوتی تھی تو اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اگر

ستاروں کے متعلق کوئی نئی بات کہہ دیتا تو اس کے لئے بہت خطرناک صورت پیش
آسکتی تھی اور مرتد ہونے کے جرم میں اسے قید یا قتل کردیا جاتا تھا۔ علمِ نجوم کے حقائق
کے سلسلے میں یونان اور قدیم روم کے اندر بھی حساسیت موجود تھی باوجودیکہ قدیم یونان
کو علم کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ "پلی نیوس" لکھتا ہے کہ اناگزاگورس کو اصرار تھا
کہ وہ یونان میں ایرانی علم و نجوم کا درس دے گا اور اسی بناء پر اسے یونان کے ساتھ
خیانت کرنے کے الزام میں جلاوطن کردیا گیا۔

سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مختلف اقوام یہاں تک کہ یونانیوں جیسی قوم کا علمی حقائق
کے بارے میں اس قدر حسّاس ہونے کا سبب یہ تھا کہ لوگوں نے ستاروں کی حرکات
چونکہ اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں لہٰذا انہیں یقین تھا کہ جو کچھ انہیں نظر آرہا ہے
وہی حقیقت ہے۔

چونکہ ستاروں کی حرکات تمام لوگوں کے مشاہدے میں آتی تھیں اور محسوس ہوتی
تھیں لہٰذا وہ کسی سے یہ سن ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ حرکات حقیقت سے عاری ہیں۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ مشرق و مغرب میں دیگر علمی مسائل کے سلسلے میں کچھ باتیں
رواج کے خلاف کہی گئی ہیں مثلاً حرکت کے بارے میں کہ آیا حرکت تھی اور دنیا بعد
میں پیدا ہوئی! یا دنیا پہلے وجود میں آئی اور حرکت بعد میں پیدا ہوئی؟ لوگوں نے ایسی
باتیں کہیں جو مروّجہ خیالات کے خلاف تھیں۔ یا روح و جسم کے بارے میں کہ پہلے
روح پیدا ہوئی اور اس نے جسم کو وجود بخشا یا پہلے جسم ایجاد ہوا اور اس کے بعد روح
وجود میں آئی۔ کافی باتیں پرانے خیال کے خلاف کہی گئی ہیں لیکن کسی جدید نظریہ کے
پیش کرنے والے اور نئی بات کہنے والے پر ایک بار بھی کفروارتداد کا الزام عائد نہیں کیا
گیا۔

چونکہ لوگ ان چیزوں کو جن پر عقیدہ چلا آرہا تھا نہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے
اور نہ محسوس کرسکتے تھے لہٰذا اگر کوئی شخص حرکت یا روح کے متعلق سنّت کے خلاف
باتیں کہتا تھا تو اس پر کفر کا الزام نہیں لگتا تھا سوائے ان باتوں کے جو اصولِ دین مثلاً

توحید یا نبوّت کی مخالفت میں ہوں۔

یونانی عالم اور فلسفی اناگزیمن جس کا زمانۂ حیات ساتویں صدی قبل مسیح میں تھا اور
اس کے حالات زندگی سے ہم زیادہ واقف نہیں ہیں کہتا تھا کہ سورج ایک پگھلی ہوئی
اور زمین سے بہت بڑی چیز ہے جو ہمیں اس لئے چھوٹا نظر آتا ہے کہ ہم سے کافی دور
ہے۔ اگر یہ زمین سے بڑا نہیں ہوتا اور پگھلا ہوا ہونے کے سبب کافی گرم نہ ہوتا تو
ساری زمین کو روشن نہ کرسکتا اور ہم اس کی حرارت کو محسوس نہ کرسکتے۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے فلسفی کا یہ قول ایک ایسی چیز ہے جو سورج کے متعلق
ہماری آج کی معلومات کے مطابق ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ سورج اس قدر پگھلا ہوا
ہے کہ گیس کی شکل رکھتا ہے۔ یہ نظریہ یونان سے بابل پہنچا لیکن وہاں جو شخص یہ کہتا
تھا کہ سورج ایک پگھلا ہوا مادہ اور زمین سے بڑا ہے تو کافر قرار پاتا تھا کیونکہ ان کے
اصول اور عقیدے کے مطابق سورج بڑے بت (یعنی بابل کے سب سے بڑے بت) کا
چراغ تھا جسے وہ ہر صبح کو روشن کرتا تھا اور شام کو بجھا دیتا تھا اور اناگزیمن کا نظریہ اس
بابلی عقیدے سے متصادم تھا۔ اناگزیمن دنیا کی پیدائش کے بارے میں کہتا تھا کہ ہوا تمام
موجودات کا مبداء ہے اور ہر چیز ہوا سے حاصل ہوتی ہے۔ بابل میں جو شخص اس کے
نظریے کو قبول کرتا تھا وہ کافر ہوجاتا تھا اور پھر بابل کی عظیم عبادت گاہ کے دروازے
اس کے لئے بند ہوجاتے تھے اور اسے ملکی معاملات میں بھی شامل نہیں کیا جاتا تھا۔

"او میستھڈ" نے اپنی کتاب (مسیح تاریخ کی روشنی میں) میں بابل کے دو دانشمندوں
کے نام لئے ہیں جنہوں نے اناگزیمن کا نظریہ قبول کیا تھا لہٰذا حکومت کے معاملات سے
معذول کئے گئے اور زندگی ان کے لئے اتنی دشوار ہوگئی تھی کہ مجبوراً انہیں بابل سے
نکلنا پڑا۔

یونان کے دانشمند اور فلسفی اناگز۔منڈر نے بھی دنیا کی پیدائش کے بارے میں ایک
ایسا نظریہ پیش کیا جو اہلِ بابل کے رسمی عقیدے سے متصادم تھا۔

اناگز۔منڈر (جو ۶۱۱ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۵۴۷ قبل مسیح میں فوت ہوا) کہتا تھا

ابتداء میں ہستی یا وجود' زمانے کے اعتبار سے لامتناہی اور مکان کے لحاظ سے لامحدود شے تھی جس کی تعریف کسی طرح ممکن نہیں۔

اسی ناقابلِ توصیف شے کے کچھ حصے آپس میں جمع ہوئے جس کے نتیجے میں جرم پیدا ہوا اور پھر اسی جرم سے اجسام وجود میں آئے اناگزیمنڈر نے کہا کہ اس ناقابلِ توصیف شے کا باہمی اجتماع' ایک معیار اور اندازے پر نہیں تھا ایک حصے کا اجتماع زیادہ شدید تھا جس سے پتھر اور دھاتیں پیدا ہوئیں اور دوسرے کا خفیف و کمتر تھا جس کی وجہ سے نباتات و حیوانات اور انسان وجود میں آئے پھر تیسرے حصے کا اس سے بھی کم اور ہلکا تھا چنانچہ اس سے پانی اور ہوا کی پیدائش ہوئی ہم دیکھتے ہیں کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے اس یونانی فلسفی نے دنیا کی خلقت کے بارے میں وہی کچھ کہا تھا جو آج دو ہزار چھ سو سال کے بعد ہم کہہ رہے ہیں۔

ہمارے اس دور کے علمِ فزکس کے بڑے بڑے ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا کی ابتداء میں صرف ہائیڈروجن تھی لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ہائیڈروجن کس چیز سے پیدا ہوئی تو ان کا جواب وہی اناگزیمنڈر کا نظریہ ہوتا ہے وہ ہمیں یہ نہیں سمجھا سکتے کہ پہلی غیر محدود اور لامتناہی شے جس سے ہائیڈروجن پیدا ہوئی کیا تھی اور کیا ہے؟ کیونکہ قوی احتمال یہی ہے کہ وہ ناقابلِ تعریف شے اب بھی موجود ہے اور ہائیڈروجن کو پیدا کرتی رہتی ہے اگر وہ ہماری کہکشاں ۔۔ (جس کا ایک جزو سورج اور نظام شمسی بھی ہے) میں نہ پائی جائے تو دوسری کہکشاؤں میں پائی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ آج فزکس اور آسٹروفزکس یعنی ستاروں کی طبیعیاتی شناخت کی اتنی ترقی کے بعد بھی علمِ طبیعیات کے اعتبار سے دنیا کے آغاز کے بارے میں ہمارا نظریہ چھٹی صدی عیسوی کے یونانی فلسفی کے نظریے کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔

ہائیڈروجن کا ایک ایٹم جو دیگر عناصر کے ایٹموں میں سب سے ہلکا ہے ایک الیکٹران اور ایک پروٹان کا حامل ہوتا ہے الیکٹران پروٹان کے گرد گردش کرتا ہے اور ابھی تک کوئی طبعی نظریہ ابتدائی ناقابلِ توصیف شے کی تبدیلی کے علمی قانون کو الیکٹرون اور پروٹون

پر روشن نہ کرسکا یعنی اس کے علمی قانون کا ابھی تک کوئی سراغ نہ لگا سکا اور ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ الیکٹرون اور پروٹون میں پہلے کون سی شے وجود میں آئی یا وہ دونوں ایک ساتھ ہی نمودار ہوئے' وہ کیا صورت تھی جہاں یہ مثبت و منفی چارج رکھنے والی طاقتیں اس ناقابلِ توصیف ابتدائی شے سے اچانک ظہور پذیر ہوئیں' انیسویں صدی عیسوی سے آج تک اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض ایک تھیوری ہے اور ہم آغازِ آفرینش کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے ہیں جتنا "اناگزیمنڈر" کے دور کے اہلِ یونان جانتے تھے' اناگزیمنڈر کا نظریہ سابق یونانی فلسفی اناگزیمن کے نظریے کے مانند بابل پہنچا اور کچھ لوگوں نے اسے قبول کیا لیکن کسی کے اوپر اس نظریے کے دلائل قبول کرنے کی وجہ سے کفر کی تہمت نہیں لگی اور وہ ملکی معاملات سے بے دخل نہیں کیا گیا کیونکہ بابل والے نظریۂ اناگزیمنڈر کے باطل ہونے کی دلیل اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے تھے اور ان سے قبل بھی کسی شخص نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ دنیا کس طرح پیدا ہوئی۔

البتہ وہی لوگ ہر صبح اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ سورج روشن ہورہا ہے اور پھر شام کو مشاہدہ کرتے تھے کہ وہ خاموش ہورہا ہے لہٰذا اناگزیمن کے نظریے کو تسلیم نہیں کرسکتے تھے کہ سورج ایک پگھلا ہوا جسم ہے اور زمین سے بڑا ہے وہ چونکہ ہر صبح و شام سورج کو روشن اور خاموش ہوتے ہوئے دیکھتے تھے لہٰذا یقین رکھتے تھے کہ بابل کا بڑا خدا اسے جلاتا اور بجھاتا ہے اور اگر بقول یونانی فلسفی کے ایک پگھلا ہوا اور زمین سے بڑا جسم ہوتا تو روشن اور خاموش نہ ہوتا۔ رہا اناگزاگورس جو ایرانی علمِ نجوم کی تعلیم دینے کے جرم میں یونان سے نکالا گیا تو اس کا قصور سورج سے متعلق نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ ایرانی کیلنڈر کو یونان میں رائج کرے وہ کیلنڈر جس کے مطابق سال کے کچھ زائد ۳۶۵ دن مانتا تھا اور اس کے مہینوں کے کچھ نام بے ستون کے کتبہ پر لکھے ہوئے ہیں۔ ایران میں ہخامنشی دور کے بعد سے کوئی کتبہ اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔ ۳۶۵ سے کچھ زائد دنوں کا سال ایران کی مدون تاریخ سے قبل ہی معلوم کیا جاچکا تھا موجودہ تاریخ کی اسناد پتہ دیتی ہیں کہ قدیم مصری لوگ دو ہزار سال قبل مسیح یہ نہ

جانتے تھے کہ سال ۳۶۵ سے کچھ زائد دنوں کا ہوتا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ آیا ابتدا میں بابلیوں نے اس کی تحقیق کی یا مصریوں نے اور شاید جیسا کہ بعض اہلِ نظر کا قول ہے کہ علمِ نجوم و ہیئت اور دیگر علوم کسی ایک دانشمند قوم سے دوسری قدیم قوموں تک پہنچے اور وہ قوم بقول افلاطون کسی قدرتی حادثے کی بنا پر ختم ہو گئی بہرحال دوسری صدی ہجری کے ابتدائی نصف حصے میں جب امام جعفر صادقؑ نے درس دینا شروع کیا تو سورج کے بارے میں انسانوں کی معلومات مذکورہ تشریح کے مطابق تھیں اور جس ملک میں جو شخص مروّجہ عقیدے کے خلاف سورج کے متعلق کوئی جدید نظریہ پیش کرتا تھا اسے مرتد قرار دے دیا جاتا تھا لیکن اسلامی دنیا میں رہنے والے لوگ سورج کے متعلق عام تصوّر یا سنّت سے ہٹ کر جو چاہتے کہتے اور جس طرح چاہتے اظہارِ رائے کرتے تھے اسی وجہ سے جب امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ زمین گھومتی ہے اور یکے بعد دیگرے روز و شب اسی گردش کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں تو کسی نے آپؑ پر تہمت لگانے کی کوشش نہیں کی۔

گزشتہ ابواب میں ہم نے دیکھا کہ زمین کی گردش کا خیال یونان کے "اندرا قلیدس" کے دماغ میں آیا لیکن وہ اس بات کی طرف متوجہ نہیں تھا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے بلکہ وہ کہتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے ۔ اور یہ بات اس وقت کہی گئی جب لوگ اپنے مشاہدات اور محسوسات کے خلاف کوئی بات قبول کرنے پر تیار نہ تھے ایسے حالات میں اقلیدس کا یہ قول اس کی عالی دماغی کی دلیل ہے۔

زمین کا گول ہونا بھی وہ علم ہے جس کو نوعِ بشر ہزار سال قبل مسیح سے جانتی ہے اور مصری لوگ اس حقیقت سے باخبر تھے۔

مصریوں کے بعد عربوں کو زمین کے گول ہونے کا علم حاصل ہوا پانچویں صدی ہجری میں جغرافیائی نقشے تیار کرنے والا عرب کا مشہور جغرافیہ داں "الادریسی" اس بات کو جانتا تھا کہ زمین کی شکل گول ہے۔ البتہ اس بات کی تحقیق کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے ایک ایسا خیال تھا جو عام افراد کے دماغوں میں نہیں سماسکتا تھا اور صرف

وہی شخص یہ نظریہ قائم کرسکتا تھا جو غیر معمولی فہم و فراست کا مالک ہو' فطرت بہت سے انسانوں کو غیر معمولی فہم و فراست عطا کرنے میں بخل سے کام لیتی ہے اور صرف اسی شخص کو اس کا حامل تسلیم کیا جاسکتا ہے جو بغیر کسی وسیلے کے کسی ایسی حقیقت تک رسائی حاصل کرلے کہ اس کے قبل ہر شخص اس کے برعکس چیز کو حقیقت سمجھتا رہا ہو۔

---☆---☆---

زمین کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا نظریہ

جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ پرانے زمانے ہی سے انسان کو یہ معلوم تھا کہ زمین گول ہے' پرتگال اور اسپین کے تمام بحری سیّاح جنہوں نے پندرہویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصے اور پوری سولہویں صدی میں تحقیقات و انکشافات کے لئے سمندر کا سفر اختیار کیا اس سے واقف تھے کہ زمین گول ہے۔اس مقام پر ہم یہ بھی کہتے چلیں کہ پندرہویں صدی کا آخری نصف زمانہ اور پوری سولہویں صدی دنیا کی پوشیدہ چیزیں دریافت کرنے کے سلسلے میں اس صدی کے مقابل جبکہ آدمی چاند کے اوپر قدم رکھ چکا ہے زیادہ دلچسپ اور قابلِ توجہ تھی ۔اگر ہم پرتگال کے "واسکوڈے گاما" کا سفر نامہ پڑھیں جس نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا تو اس کے سامنے چاند کی جانب پرواز کرنے والے فضائی راکٹ (اپولو) کی داستانِ سفر پھیکی نظر آتی ہے۔

اگر "ماجلان" کا سفرنامہ پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ اس کے قافلے کے ۲۶۸ افراد زمین کے گرد تین سال کے سفر میں کس قدر مصیبتوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہوئے اور ان میں سے صرف ۱۸ افراد واپس لوٹے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اپولو جہازوں کا سفر واقعات کے لحاظ سے اس کے مقابلے میں ہلکا ہے۔ ہندوستان کے بحری راستے کا پتہ لگانے والا واسکوڈے گاما' امریکہ کا انکشاف کرنے والا کرسٹوفر کولمبس اور "ماجلان" زمین کے گرد چکر لگانے والا سب سے پہلا سیّاح سبھی جانتے تھے کہ زمین گول ہے لیکن ان

میں سے کسی نے بھی کوئی نیا انکشاف کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ان کا مقصد صرف مادی فوائد حاصل کرنا تھا۔ ان تینوں افراد کی نمایاں حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ زمین گول ہے ان کے سفرناموں سے کسی ایسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ اس بات سے بھی واقف رہے ہوں کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے یہاں تک کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اٹلی کا گیلیلو بھی زمین کی اپنے گرد گردش سے واقف تھا یا نہیں؟

گیلیلو ایک منجم' ریاضی دان اور علمِ فزکس پر دسترس رکھنے والا ماہر دانشمند تھا' ترقی یافتہ علوم کا ایک حصہ اس کے دریافت کردہ علمی قوانین کا مرہونِ منت ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس نے امریکہ کی دریافت کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد وفات پائی البتہ قوی احتمال یہی ہے کہ وہ بھی زمین کی اپنے گرد گردش کے بارے میں لاعلم تھا اور جس روز محکمۂ تفتیشِ عقیدہ (Inquisition) نے اس کو توبہ اور استغفار پر مجبور کیا تو یہ اپنے گرد زمین کی گردش کے نظریے کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کے اس قول کی وجہ سے تھا کہ "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے"۔

"ماجلان" کے ستاون (۵۷) سال بعد ایک انگریز بحری سیاح فرانس ڈریک نے بھی مادی فوائد کے پیش نظر دنیا کے گرد چکر لگانا شروع کیا اور اس نے یہ سفر ۱۵۸۰ء میں مکمل کیا۔

جب اس انگریز سیاح نے اپنا سفر شروع کیا تو ہر کس و ناکس کو زمین کے گول ہونے کا علم تھا۔ لیکن وہ زمین کی اپنے ہی گرد گردش سے بے خبر تھا اور سورج کے طلوع و غروب کو زمین کے گرد سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھتا تھا حالانکہ وہ اپنے زمانے میں دانشور شمار کیا جاتا تھا۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ اپنے گرد زمین کی گردش کا مسئلہ قبول کرنا لوگوں کے لئے کس قدر دشوار تھا ہم دیکھتے ہیں کہ فرانس کا ہنری پوانکارہ بھی اس بات کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے ۱۹۱۲ء میں ۵۸ سال کی عمر میں انتقال کیا اور یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا ریاضی

واں تھا اس کی تاریخِ وفات بتاتی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں موجود تھا۔ پھر بھی شوخی کے ساتھ کہتا تھا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ زمین اپنے گرد چکر لگا سکتی ہے۔ جب ہنری پوانکارہ جیسا دانشمند بیسویں صدی کے آغاز میں اس نظریے کی تردید کرے تو ظاہر ہے کہ دوسری صدی ہجری کے ابتدائی حصے کے لوگ بدرجہ اولیٰ اسے تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔

زمین کی اپنے گرد گردش محسوس طریقے سے اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکی جب تک انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھے اور وہاں سے زمین کا مشاہدہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ خلا نورد اپنی خلانوردی کے ابتدائی برسوں میں بھی زمین کی گردش اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ اس دور میں ان کا کوئی مستقل اڈا نہیں تھا اور وہ ایسے جہازوں میں تھے جو ہر نوّے منٹ یا اس سے کچھ زائد میں زمین کا چکر پورا کر لیتے تھے اور وہ اس تیز رفتاری کے عالم میں زمین کی حرکت اور کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے چاند کو اپنا ٹھکانا بنایا اور وہاں سے اپنی تصویر بردار دوربین کے ذریعے زمین کا معائنہ کیا تو نظر آیا کہ یہ آہستہ آہستہ اپنے گرد گھوم رہی ہے اور اس روز پہلی بار زمین کی گردش کا مشاہدہ ہوا۔

آج ہم جانتے ہیں کہ نظامِ شمسی میں کوئی ایسا ستارہ نہیں ہے جو اپنے گرد گھومتا نہ ہو، اور ان تمام ستاروں کی اپنے گرد حرکت نظامِ شمسی کے میکانیکی قوانین کی پابند ہے چنانچہ سورج بھی جو نظامِ شمسی کا مرکز اور ناظم ہے اپنے گرد گھومتا ہے اور اس کی یہ حرکت خطِ استواء میں زمین کے ۲۵ شب و روز کی مدت میں مکمل ہوتی ہے۔

جو قانون نظامِ شمسی میں ستاروں کو ان کے گرد چکر دیتا ہے وہی خلائی جہازوں کو بھی گردش دیتا ہے گیلیلیو نے فلکی دوربین ایجاد کرنے کے بعد جب ان سیاّروں کا معائنہ کیا تب اس چیز کی طرف متوجہ ہوا کہ یہ اپنے گرد گھوم رہے ہیں اس بات کے پیشِ نظر گیلیلیو اس سے بخوبی آگاہ تھا کہ زمین نظامِ شمسی کے دیگر سیاّروں کی مانند سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے لیکن ہمیں اس کے اقوال و آثار میں ایسے کسی خیال کا پتہ

نہیں ملتا، آیا اس دانشور نے محکمۂ تفتیشِ عقیدہ کے ڈر سے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے؟ اس لئے کہ اگر توبہ اور استغفار کے بعد زمین کی اس حرکتِ وضعی کا ذکر کرتا تو اس توبہ شکنی کی وجہ سے پھر اسے کوئی شخص زندہ آگ میں جلائے جانے سے نہ بچا سکتا کیونکہ مذکورہ محکمے کی نظر میں اس کی بدنیتی ثابت ہو جاتی۔

گیلیلیو نہ صرف اپنی طولِ حیات میں اس مسئلہ پر خاموش رہا بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے کاغذات سے کوئی ایسا مواد ہاتھ نہ آیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اسے زمین کی اپنے گرد گردش کا علم تھا۔

سولہویں صدی عیسوی میں ڈنمارک کی سرزمین پر تیخو براھہ یا ٹیکو براھہ نامی ایک اور علمِ ہیئت کا ماہر دانشمند بھی زمین کی اپنے گرد گردش کا قائل تھا۔ اس کا شمار شرفاءِ ڈنمارک میں کیا جاتا تھا اور نانِ شبینہ کے محتاج "کوپرنیک" کے برخلاف بڑی پُرتکلف زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اپنے محل میں بہت پرشکوہ انداز میں دعوتوں کا انتظام کیا کرتا تھا۔

اس نے ۱۶۰۱ء یعنی سترھویں صدی عیسوی کے پہلے سال میں وفات پائی یہ وہی شخص تھا جس کے نجومی مطالعات نے جرمنی کے کیپلر کی بہت مدد کی۔ کیپلر ٹیکو براہہ کے بغیر سیاّروں کی حرکت کے متعلق اپنے تین مشہور قوانین کو جن میں سورج کے گرد زمین کی حرکت بھی شامل ہے پیش نہیں کر سکتا تھا اس کے باوجود ٹیکو براھہ زمین کی اپنے ہی گرد گردش کا پتہ نہیں لگا سکا۔ اگر اسے علم ہوتا تو وہ اس کا اسی طرح اظہار کرتا جس طرح کھل کر اس نے سورج کے گرد زمین کی گردش کا اعلان کیا تھا۔ ٹیکوبراھہ ایسے ملک کا باشندہ تھا جہاں (ڈنمارک) محکمۂ تفتیشِ عقیدہ کی کوئی شاخ یا نمائندہ موجود نہیں تھا لہٰذا اگر وہ ایسی تحقیق کر سکا ہوتا تو بے خوف و خطر اس کا اعلان کر دیتا۔

کوپرنیک اور کیپلر نے بھی سورج کے گرد زمین کی گردش سے متعلق اپنا نظریہ اسی وجہ سے برملا بیان کر دیا کہ ان کا علاقہ محکمۂ تفتیشِ عقیدہ کے اختیار سے باہر تھا۔

جس زمانے میں محکمۂ تفتیشِ عقیدہ شدّت کے ساتھ اس نظریے کے اظہار سے روکتا تھا اسی دور میں مخربِ اخلاق اور نفرت انگیز کتابیں کھلے عام دستیاب تھیں لیکن یہ

محکمہ نہ انہیں ممنوع قرار دیتا تھا نہ ان کے مصنفین سے کوئی باز پرس کرتا تھا۔ جرمنی کے کیپلر (متوفی ۱۶۳۰ء) نے ستاروں کی رفتار کے بارے میں جو تین قانون بتائے تھے۔ وہ نہ صرف اس دور کی علمی دنیا کے لئے حیرت و تحسین کا باعث بنے بلکہ آج بھی ہر شخص اس کے تین نکاتی قانون کو پڑھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ان قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ سورج کے گرد زمین سمیت تمام سیاروں کی حرکت "کوپرنیک" کے نظریہ کے برخلاف دائرہ کی شکل میں (مدور) نہیں ہے بلکہ وہ بیضوی صورت میں سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اور سورج دو بیضی "کانوں" میں سے ایک کانوں (مرکز) میں مقیم ہے۔

کیپلر کے دریافت کردہ تینوں قوانین پر بحث کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ستاروں کے بارے میں ایسی بحث کا سلسلہ شروع کر دیں۔ جس کی تفصیل ہمارے محترم قارئین کے لئے تھکاوٹ کا باعث ہو ــــ اس موجودہ صدی کے آخری نصف حصے میں جب کہ آسمان کی طرف خلائی جہازوں کا سفر ایک معمول بن چکا ہے کیپلر کے پہلے قانون کی حقیقت ثابت ہو گئی ہے کیونکہ یہ راکٹ یا جہاز جو انسان کے ہاتھوں فضاء میں بھیجے جاتے ہیں زمین یا چاند کے گرد ایک بیضوی مدار کو طے کرتے ہیں۔ یہ عظیم دانشور بھی جس نے ستاروں کے تین قوانین کاانکشاف کر کے اپنی برتری ثابت کی لیکن زمین کی اپنے گرد گردش کے بارے میں معلوم نہ کر سکا۔

لیکن امام جعفر صادقؑ نے آج سے بارہ سو سال پہلے یہ معلوم کر لیا تھا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے اور یکے بعد دیگرے شب و روز کی آمدورفت کا سبب زمین کے گرد آفتاب کی گردش نہیں (کیونکہ یہ عقلاً قابلِ قبول نہیں ہے) بلکہ اپنے گرد زمین کی گردش ہے جس سے رات اور دن وجود میں آتے ہیں اور ہمیشہ نصف زمین تاریک اور رات کی حالت میں اور دوسرا نصف حصہ روشن اور دن کے عالم میں رہتا ہے۔قدما جو زمین کے گول ہونے کے قائل تھے یہ جانتے تھے کہ ہمیشہ زمین کے نصف حصے میں رات اور دوسرے نصف حصے میں دن رہتا ہے لیکن وہ شب و روز کو زمین کے چاروں

طرف سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

آخر کیا بات تھی کہ امام جعفر صادقؑ نے آج سے بارہ سو سال پہلے ہی پتہ لگا لیا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے اور اسی سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں؟

پندرھویں' سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی کے دانشور جن میں سے بعض کے نام لئے جا چکے ہیں باوجودیکہ ستاروں کے چند میکانیکی قوانین دریافت کر چکے تھے لیکن اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکے کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے پھر امام جعفر صادقؑ مدینے جیسے دور افتادہ علاقے میں رہ کر جو اس دور کے علمی مراکز سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ کیونکر یہ دریافت کر سکے کہ زمین اپنے گرد گردش کرتی ہے۔

اس زمانے کے علمی مراکز قسطنطنیہ' انطاکیہ اور گندی شاپور تھے اور اس وقت تک بغداد علمی حیثیت سے اتنی اہمیت کا حامل نہیں تھا کہ اس کو مرکزیت حاصل ہوتی اور ان مذکورہ بالہ تینوں مراکز میں کوئی یہ معلوم نہ کر سکا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں روز و شب کا ظہور ہوتا ہے۔

آیا امام جعفر صادقؑ جنہوں نے اس علمی حقیقت کو معلوم کیا۔ ستاروں کے [illegible] قوانین سے باخبر تھے؟ اور جانتے تھے کہ قوتِ جاذبہ کا اثر جو دو شکلوں میں یعنی ایک مرکز سے فرار کی صورت میں اور دوسرے مرکز کی طرف جذب و کشش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس چیز کا سبب بنتا ہے کہ اجرامِ فلکی اپنے گرد گردش کریں؟

اس لئے کہ یہ بات عقل سے بعید ہے کہ آپؑ جذب و فرار کے قانون کو جانے بغیر زمین کی اپنے گرد گردش کی حقیقت کو جان سکیں۔

---☆---☆---

امام جعفر صادقؑ کی نظر میں خلقت کا مسئلہ

اگر یہ کہا جائے کہ زمین کی حرکت کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی یہ تحقیق فہم و فراست کی بناء پر تھی کیونکہ اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ بعض اشخاص اپنی عقل سے کوئی فتویٰ لگاتے ہیں اور بعد میں وہ بات حقیقت کے مطابق نکلتی ہے تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آپ کے بعد اتنی صدیوں کی طویل مدت میں کسی اور نے اپنی عقل سے یہ کیوں نہیں کہا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے؟ اس بناء پر ثابت ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے پہلے ستاروں کے میکانیکی قوانین سے واقفیت حاصل کرلی تھی تاکہ ان سے زمین کی اپنے گرد حرکت کا پتہ لگایا جا سکے اگر آپ نے ان قوانین کو دریافت نہ کیا ہوتا تو زمین کی اس گردش کا ادراک نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس موضوع کی تحقیق اتفاقی نہیں ہو سکتی، یہاں علت سے معلول کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

البتہ آپ نے اس علت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے جس کے سبب زمین کی اپنے گرد گردش کی حقیقت آپ پر منکشف ہوئی، حالانکہ فزکس کے بعض مسائل کے سلسلے میں آپ نے ایسی چیزیں بیان فرمائی ہیں جو تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں موجودہ دور کی تھیوری کے عین مطابق ہیں اور اس دور کے علمِ فزکس کا ایک دانشمند جب امام جعفر صادقؑ کی تھیوری کو پڑھتا ہے تو وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں آپؑ کا نظریہ فزکس کی جدید تھیوری کے عین مطابق ہے۔

تخلیقِ کائنات کا نظریہ ابھی علمی قانون کی صورت اختیار نہیں کر سکا ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض ایک تھیوری ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو اور ہو سکتا ہے کہ غلط ہو۔

پیدائشِ دنیا کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی تھیوری بھی اسی انداز پر ہے اور علمی قانون کی حیثیت میں سامنے نہیں آئی ہے جس سے اسے ایک ناقابلِ تردید حقیقت سمجھا جائے البتہ یہ خصوصیت ضرور رکھتی ہے کہ باوجودیکہ بارہ سو سال قبل پیش کی گئی تھی لیکن فزکس کی جدید تھیوری سے مطابقت رکھتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ تخلیقِ کائنات کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا ایک جرثومے سے پیدا ہوئی ہے وہ جرثومہ دو متضاد قطبوں کا حامل ہے جس سے ذرے کی پیدائش ہوئی پھر مادہ وجود میں آیا اور اس میں تنوع پیدا ہوا اور مادے کا تنوع اس کے ذرّات کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تخلیقِ کائنات کی یہ تھیوری آج کی جدید ایٹمی تھیوری سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

دو متضاد قطب دراصل ایٹم کے دو مثبت اور منفی چارجز ہیں اور یہی دو چارجز ایٹم کو وجود میں لانے کا باعث بنے پھر ایٹم سے مادہ وجود میں آیا۔ عناصر کے درمیان پایا جانے والا فرق ان چیزوں کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے جو ان کے جوہروں میں موجود ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم نے دنیا کی پیدائش کے بارے میں پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کے بعض یونانی فلسفیوں کے نظریات کو ملاحظہ کیا اور یہ بھی دیکھا کہ "ڈیموکریٹ" (دیمقراطیس) نے تخلیقِ کائنات کے سلسلہ میں ایٹم کے نظریہ کو پیش کیا۔ ممکن ہے امام جعفر صادقؑ کو اس یونانی فلسفی کی تھیوری کا علم ہو اور آپ نے اپنے نظریہ کو اسی تھیوری کی اساس پر موقوف فرمایا ہو۔

اگر امام جعفر صادقؑ قدیم یونان کے فلسفیوں کے نظریات سے باخبر تھے تو وہ نظریات اسی ذریعے سے وہاں پہنچے ہوں گے جس ذریعے سے جغرافیہ اور ہندسہ مدینے تک پہنچا یعنی مصری علماء اور قبطی فرقے کے توسط سے۔

ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ چونکہ امام جعفر صادقؑ کو پیدائش کے بارے میں ان تھیوریز

سے واقفیت تھی جنہیں قدیم یونانی دانشمندوں نے آپ سے بارہ تیرہ سو سال قبل بیان کیا تھا اس لئے آپؑ ان تھیوریز کی تکمیل فرماکر تخلیق کائنات کے بارے میں ایسا نظریہ پیش کر سکے جسے آج علمِ فزکس کے ماہرین تسلیم کرتے ہیں اور اس نظریہ کے مقابل میں اس سے بہتر نظریہ پیش نہ کر سکے۔ اس نظریے کا سب سے نمایاں حصہ دو متضاد قطبوں کا موضوع ہے۔امام جعفر صادقؑ سے قبل یونان کے فلاسفہ اور اسکندریہ کے دانشوروں نے تحقیق کی تھی کہ ہستی اور وجود میں اضداد پائے جاتے ہیں اور ان میں سے بعض نے کہا تھا کہ ہر چیز کو اس کی ضد سے پہچاننا چاہیے۔

لیکن امام جعفر صادقؑ کی تھیوری میں اضداد سے متعلق ایک واضح نظریہ بیان کیا گیا ہے اور یہ وضاحت نہ یونان کے قدیم فلسفیوں کے نظریے میں موجود ہے نہ اسکندریہ کے علمی مکتب کے علماء کے نظریے میں۔ یونان اور اسکندریہ کے دانشوروں نے اضداد کے بارے میں اپنے نظریات کو گریز کی گنجائش کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے نظریہ میں غلطی پر تھے تو فوراً اپنے بیان کو واپس لے سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت اس لئے پیدا ہوئی کہ انہیں اپنی بات پر پورا یقین نہیں تھا اور وہ اپنی تھیوری کو معتبر نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن امام جعفر صادقؑ نے اپنے نظریے کو بغیر کسی قید و شرط کے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور آپ کی تھیوری میں "اگر" اور "لیکن" کا وجود نہیں ہے۔ آپ کے نظریے کی صراحت ثابت کرتی ہے کہ آپ کو اپنی بات پر پورا یقین تھا۔ اور اپنے لئے انحراف کا راستہ کھلا نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ (اس مقام پر مسیحی علماء نے اپنے خیال میں شیعوں کے عقیدے کی رد کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تخلیقِ کائنات ' عناصرِ کیمیا و ریاضیات اور دوسرے علوم کے سلسلے میں امام جعفر صادقؑ کے اقوال ایک مورخ کے نزدیک علمِ لدنی اور علمِ امامت کے تحت نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ نے یقیناً ابتدائی تعلیم کسی استاد سے حاصل کی ہوگی جیسا کہ آپ اپنے والد کی درس گاہ میں بھی مدتوں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ لہٰذا ایسا شخص علمِ لدنی کا حامل نہیں ہو سکتا

درحالیکہ ان کی یہ دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی کیونکہ اوّل تو آپ کا کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا ثابت نہیں دوسرے اگر آپ نے اپنے والد امام محمد باقر علیہ السلام کی درس گاہ میں ہی یہ سب کچھ سیکھا تھا تو درس گاہ کے دیگر شاگردوں نے بھی جو آپ کے ہم درس تھے یہی انکشافات کیوں پیش نہیں کئے؟ اور تیسرے یہ کہ اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ آپ نے اپنے والد سے سیکھا شیعوں کا عقیدہ باطل نہیں ہوتا کیونکہ امام محمد باقر علیہ السلام بھی تو امام اور علمِ لدنی کے حامل تھے اور پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے کس سے سیکھا تھا؟ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ بالآخر یہ سلسلہ خدا اور رسولؐ تک ہی پہنچ کر ختم ہوگا۔ فہو المطلوب ۔ مترجم اردو) امام جعفر صادقؑ نے پیدائشِ عالم کے سلسلے میں جو باتیں بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک یہی دو متضاد قطبوں کی بات ہے' آپ کے قول کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب سترہویں صدی عیسوی کے بعد فزکس میں دو متضاد قطبوں کا وجود ثابت ہوا۔

آپ کے معاصرین اور بعد میں آنے والوں نے دو متضاد قطبوں کو قدما کے ان اقوال میں شامل کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ آپ کے قول کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب فزکس میں دو متضاد قطبوں کا وجود ثابت ہوا اور آج بھی ایٹم شناسی اور الیکٹرونکس (Electronics) میں دو متضاد قطبوں کا وجود ناقابل تردید ہے۔

ہم نے عناصر اور پیدائشِ کائنات کی بحث میں امام جعفر صادقؑ کے علوم کا تذکرہ جغرافیہ' نجوم اور فزکس سے شروع کیا ہے۔ چنانچہ ابھی ہم فزکس کا بیان جاری رکھیں گے اور اس کے بعد دیگر مسائل پر گفتگو کریں گے' فزکس میں امام جعفر صادقؑ نے ایسی چیزیں بیان فرمائی ہیں جنہیں آپ سے پہلے کسی نے نہیں بتایا اور آپ کے بعد بھی اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصے میں انیسویں صدی تک کسی کی عقل میں نہیں آئیں

علمِ فزکس کے سلسلے میں امام جعفر صادقؑ نے جو قوانین بتائے ہیں ان میں سے

ایک اجسام کے شفاف اور غیر شفاف ہونے سے متعلق ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ جو جسم جامد اور جاذب ہوتا ہے وہ غیر شفاف اور کثیف ہوتا ہے اور جو جامد اور دافع ہوتا ہے وہ کم و بیش شفاف نظر آتا ہے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ جاذب کن معنوں میں فرمایا کہ "جاذبِ حرارت"

فزکس کا یہ نظریہ جسے آج ہم جانتے ہیں ایک الحاق کے ساتھ ایسا جاذبِ توجہ علمی قانون ہے کہ انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں ایک انسان کیونکر ایسا نادر اور انوکھا نظریہ پیش کر سکا۔

آج اگر سو آدمیوں سے یہ پوچھا جائے کہ کس وجہ سے ایک جسم کثیف اور دوسرا شفاف نظر آتا ہے تو ایک بھی جواب نہیں دے سکے گا۔ یعنی یہ نہیں بتا سکے گا کہ کس سبب سے لوہا تاریک اور کثیف اور بلور صاف و شفاف ہوتا ہے۔ موجودہ فزکس کا قانون کہتا ہے کہ جس جسم کے اندر سے حرارت کی لہریں سہولت کے ساتھ گزر جاتی ہیں یعنی وہ "الیکٹرو میگنائٹک موجیں" (Electromagnetic Waves) جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ جسم تاریک و کثیف ہوتا ہے۔ لیکن وہ جسم جو حرارت کو بخوبی راستہ نہیں دیتا اور "الیکٹرو میگنائٹک موجیں" اس میں سے نہیں گزر سکتیں وہ روشن اور شفاف ہوتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے برقی اور مقناطیسی لہروں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ حرارت کا نام لیا ہے ' پھر بھی جو کچھ فرمایا ہے تھوڑے اضافے کے ساتھ موجودہ فزکس کے قوانین کے مطابق ہے چنانچہ یہ قوانین بتاتے ہیں کہ بعض اجسام (جیسے لوہا وغیرہ) کے کثیف و تاریک ہونے کا سبب یہ ہے کہ الیکٹرو میگنائٹک لہریں ان میں جذب ہو جاتی ہیں وہ جاذب اور راستے دینے والے ہیں لیکن جن اجسام میں حرارت جذب نہیں ہوتی اور وہ الیکٹرو میگنائٹک لہروں کے گزرنے میں حائل اور مانع ہوتے ہیں کم و بیش شفاف ہوتے ہیں۔

اجسام کی کثافت اور شفافیت کے موضوع پر امام جعفر صادقؑ کا کلی نظریہ ان کی

جاذبیت پر مبنی ہے چنانچہ جب آپ سے اس کی وضاحت چاہی گئی تو فرمایا کہ جو اجسام حرارت کو جذب کرتے ہیں وہ تاریک ہوتے ہیں اور جو حرارت کو جذب نہیں کرتے وہ کم و بیش شفاف ہوتے ہیں۔

آپؑ کے نظریے میں جاذب ہونے کا مسئلہ بھی دو متضاد قطبوں کے مانند بہت دلچسپ اور لائقِ توجہ ہے اور آپؑ کا یہی بیان اجسام کی کثافت و شفافیت کے متعلق دورِ حاضر کی فزکس کے قوانین کے مطابق ہے۔ اگر آپؑ سے توضیح بھی نہ طلب کی جاتی اور آپؑ یہ نہ بتاتے کہ حرارت جذب کرنے والے اجسام مکدّر و کثیف اور حرارت جذب نہ کرنے والے کم و بیش شفاف ہوتے ہیں تو تب بھی تنہا "جاذب" آپؑ کے مفہوم کو جدید فزکس کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن چونکہ آپ نے حرارت کا ذکر کیا ہے اور برقی اور مقناطیسی لہروں کا حوالہ نہیں دیا ہے لہٰذا آپ کے نظریہ کو جدید فزکس کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس میں (غیر شفاف اجسام کے بارے میں) برقی اور مقناطیسی لہروں کے جذب کا اضافہ ضروری ہے تاکہ بات مکمل ہو جائے۔

اس کے باوجود امام جعفر صادقؑ کا نظریہ اتنا پرکشش ہے کہ برقی و مقناطیسی لہروں کے جذب کا انکشاف نہ ہونے کے بعد بھی اس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

جو دماغ بعض اجسام کے کثیف اور بعض کے شفاف ہونے کا سبب دریافت کر لے وہ اپنے ہم عصروں کی عقل و فہم کے مقابل اتنی برتری رکھتا تھا کہ ہم بغیر کسی مبالغے کے کہہ سکتے ہیں کہ وہ علمی حیثیت سے نابغہ اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے کا دماغ تھا۔ آپؑ کے ذہنی تراوش نے فقط انہی نظریوں کو پیش نہیں کیا بلکہ علوم میں آپ کے بہت سے نظریات ہیں جنہیں ہم آئندہ پیش کریں گے۔

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے بیان کئے ہوئے قانون کی سادگی کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی جائے۔

تجربے نے یہ بات بتائی ہے کہ علمی قوانین جس قدر سادہ اور آسان ہوں گے اسی

قدر مرغوب اور مشہور ہوں گے اور لوگ انہیں فراموش نہیں کریں گے۔ ایک علمی قانون جس قدر سادہ اور آسان ہو گا اسی قدر جلد اور تیزی سے لوگوں کے درمیان مقبولیت اور شہرت پائے گا اور سب سے دیر میں فراموش ہو گا ۔ علمی قوانین کے سادہ ہونے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان کا رواج صرف ایک قوم یا ایک نسل کے اندر نہیں ہوتا بلکہ یہ تمام قوموں اور نسلوں کے درمیان پھیل جاتے ہیں۔ پندو نصائح' ضرب الامثال اور مختصر اقوال و کلمات کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں سے جو جس قدر سادہ اور آسان ہوتا ہے اسی قدر اس کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لوگ اسے یاد رکھتے ہیں' ہر قوم و نسل اسے اپناتی ہے اور یہ قبولیت اتنی رغبت کے ساتھ ہوتی ہے کہ وہ نصیحت یا ضرب المثل یا مختصر قول اس قوم کی تہذیب و تمدن کا جزو بن جاتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اس طرح کے بے شمار پندو نصائح' کلمات مرتب فرمائے ہیں جو گزشتہ تمام اقوام میں یہ جانے بغیر کہ کہنے والا کون ہے اور کیا ہے' مقبول و مشہور ہوئے۔

مثلاً آپؑ نے ارشاد فرمایا!

"درد میں مبتلا ہونے کے بعد ہی انسان کو اپنی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے" یہ قول پہلے تو مدینے میں امام جعفر صادقؑ کی زبان پر جاری ہوا 'اس کے بعد بہت سی ایشیائی' افریقی' یورپی اور پھر امریکی قوموں تک پہنچا اور جہاں بھی جس شخص نے اسے سنا اس بات کا قائل ہوا کہ کہنے والے نے صحیح کہا ہے چنانچہ ساری دنیا میں اس طرح پھیل گیا کہ اس صدی کے مشہور و معروف دانشور اور کینیڈا کی یونیورسٹی کے پروفیسر "مارشل میکلاہن" نے اسے علمِ نفسیات کا ایک قانون قرار دیا اور کہا کہ "صرف درد ہی کا موقع ایسا ہوتا ہے جب ہم اپنی ذات کو فراموش نہیں کر سکتے اور جس وقت ہمارے جسم میں کہیں درد نہیں ہوتا اور کوئی جسمانی یا روحانی تکلیف عارض نہیں ہوتی اس وقت ممکن ہے کہ ہم خود کو بھول جائیں۔"

امام جعفر صادقؑ کے اس قول کے عالمگیر حیثیت حاصل کرنے نیز تمام قوموں اور

نسلوں کی طرف سے قبول کئے جانے کا سبب اس کی سچائی اور سادگی ہے۔

آپ کے اس قول کی عالمگیر شہرت کا سبب اس کی سادگی اور دل نشینی ہے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے اوپر اس کی آزمائش کر کے اس کی درستی کا اندازہ کر سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ جس وقت تک وہ کسی جسمانی یا روحانی اذیت میں مبتلا نہیں ہوتا اس وقت ممکن ہے کہ اپنے کو اس طرح سے فراموش کر دے کہ جیسے اسے اپنے زندہ ہونے ہی کی خبر نہ ہو۔ لیکن جب کسی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے تو چاہے جتنی صبر و ضبط کی طاقت رکھتا ہو اپنے کو بھول نہیں سکتا اور وہ درد مستقل طور پر اسے یاد دلاتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔

---☆---☆---

امام جعفر صادقؑ اسلام میں عرفان کے بانی

بعض عرفاء اور مورخینِ اسلام کا بیان ہے کہ امام جعفر صادقؑ اپنے پدرِ بزرگوار امام محمد باقرؑ کی درس گاہ میں عرفان کی بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

"تذکرۃ الاولیاء" کے لکھنے والے شیخ عطار کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے حالانکہ پہلی صدی ہجری میں عرفان کا کہیں سراغ نہ تھا، اور اگر تھا بھی تو اسے مکتب کی صورت حاصل نہ تھی۔ شاید اس صدی میں عرفانی افکار موجود ہوں اور بعض مفکرینِ اسلام اس کو اپنا موضوعِ سخن بھی بناتے ہوں۔

لیکن پہلی صدی ہجری میں کسی عرفانی درسگاہ کا وجود نہیں تھا جس میں خالصتاً" عرفان کا درس دیا جاتا ہو یا جس میں کوئی پیر، مراد، قطب یا غوث اپنے شاگردوں کو اکٹھا کرکے انہیں عرفان کا سبق دیتا ہو۔ دوسرے یہ کہ عرفان مخصوص انداز کے تجلیٔ افکار کا نام تھا۔ جس کا کلاسیکی درس سے کوئی تعلق نہیں تھا مراد یا قطب اپنے مریدوں کو درس نہیں دیتا تھا وہ ان سے عمل کا خواستگار تھا اور کہتا تھا کہ درس عشق، قلم، دوات اور کاغذ کے استعمال سے حاصل نہیں ہوتا۔

بشوی اوراق اگر ہمدرس مائی
کہ درسِ عشق در دفتر نبا شد

عرفان دوسری صدی ہجری میں ظہور پذیر ہوا یا یہ کہ اس صدی میں اس نے درسگاہ

کی صورت اختیار کی۔ اس سے پہلے اس عنوان سے کوئی درسگاہ قائم نہیں ہوئی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تذکرۃ الاولیاء ایک شہرت یافتہ کتاب ہے اور بعض فضلا کے نزدیک اس کا شمار عالمِ اسلام کی معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایسی غیر معتبر روایات بھی موجود ہیں جن کی تردید میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں۔ جس میں سے ایک روایت یہ ہے کہ مشہور صوفی بزرگ "بایزید بسطامی" ایک مدت تک امام جعفر صادقؑ کے ساتھ ان کے شاگرد بن کر رہے اور آپؑ سے عرفان کا درس لیتے رہے۔ تذکرۃ الاولیا کے مطابق بایزید بسطامی نے علوم کی تکمیل کے بعد وادیٔ عرفان میں قدم رکھا اور ۱۱۳ عرفاء سے تلمذ حاصل کیا۔ جس میں سے آخری ہستی امام جعفر صادقؑ کی ذاتِ گرامی تھی وہ ہر روز امامؑ عالی مقام کی خدمتِ اقدس میں پہنچتے اور آپؑ کی باتوں کو اس توجہ کے ساتھ سنتے کہ لحہ بھر کے لئے ان کی آنکھیں آپ سے نہ پھرتیں۔ ایک دن امام جعفر صادقؑ نے ان سے کہا بایزید تمہارے سر پر جو طاق ہے اس پر سے فلاں کتاب اتار لاؤ۔ بایزید نے کہا کون سا طاق؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تم اتنے عرصے سے یہاں آرہے ہو اور تم نے ابھی تک طاق کو نہیں دیکھا! بایزید نے عرض کیا! میں اتنے عرصے صرف آپ کو دیکھتا رہا۔ اس لئے کہ میرے آنے کی غرض آپؑ تھے اور بس!

امام جعفر صادقؑ نے بایزید کے اس کلام کو سن کر فرمایا! آج سے تمہاری تعلیمات کا دور ختم ہوگیا اب میری اجازت ہے کہ تم بسطام واپس جاؤ اور وہاں جاکر خلقِ خدا کے لئے رشد و ارشاد کا ذریعہ بن جاؤ۔ بایزید نے بسطام کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر رشد و ہدایت میں مشغول ہوگئے۔

غالباً تذکرۃ الاولیاء کے لکھنے والے نے اس روایت کو صحیح سمجھ کر نقل کیا ہے لیکن چونکہ یہ روایت "کرونولوجی" (یعنی وقوعِ تاریخ کے اعتبار سے واقعات کی تنظیم) کے مطابق نہیں اس لئے قطعی درست نہیں ہے۔ اور اگر تذکرۃ الاولیاء کے لکھنے والے نے اسے از خود جعل نہیں کیا تو یقیناً کسی اور نے ایسا کیا ہے۔ اور لکھنے والے نے اس پر تحقیق و تفحص سے کام نہیں لیا۔ کیونکہ امام جعفر صادقؑ دوسری صدی ہجری کے نیمۂ

اوّل میں مشغولِ تدریس تھے۔ اور آپ کی سنِ وفات بھی ۱۴۸ ہجری ہے جب کہ بایزید بسطامی کی تاریخِ رحلت میں اختلاف ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تیسری صدی ہجری کے رہنے والے تھے پھر کس طرح وہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہنچ سکتے ہیں۔ البتہ امام جعفر صادقؑ کے دروس میں عرفان کی تعلیم سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

امام جعفر صادقؑ کے درس میں عرفان کا وجود آپ کی شخصیت کو اور بھی زیادہ قابلِ توجہ اور دلچسپ بناتا ہے اور اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ آپ کا ذوق اور لگاؤ گوناگوں تجلّیات کا حامل تھا۔

دوسری صدی ہجری سے یعنی جب سے اسلامی دور کا عرفان مشرق میں نمودار ہوا آج تک لوگوں کے نزدیک وہ ایک ایسی شئے ہے جو تخیّل و تصوّر اور ذاتی محویّت سے آگے نہیں بڑھی ہے۔

اگرچہ عارف کے اعمال پر عرفان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اسے خوش خلق، مہربان اور نوع پرور بناتے ہیں لیکن خود عرفان ایک معنوی سلوک ہے جس کا مادی اور تجرباتی علوم سے کوئی تعلق نہیں جب کہ امام جعفر صادقؑ اصولِ تجربہ کے پابند تھے۔ آپ وہ پہلی ہستی ہیں جنہوں نے اسلام میں تھیوری کو عمل سے وابستہ کیا۔ علمِ فزکس اور کیمیا کا کوئی نظریہ آپ کے نزدیک اس وقت تک قابلِ قبول نہیں تھا جب تک کہ آپ خود اس پر عمل کرکے اس کی صحت کو اچھی طرح جانچ نہ لیں آج تجربہ سے سروکار رکھنے والے علمِ فزکس اور کیمیا کے دانشمند عرفان سے بے بہرہ ہیں۔ اس لئے کہ عرفان ایک ایسی شے ہے جسے فزکس اور کیمیا کے تجربوں کے ذریعے نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ یہ وہ کیفیت ہے جو نفس کی تلقین کے زیرِ اثر ایک طویل مدت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ کو جو عالمِ اسلام میں علمِ فزکس اور کیمسٹری کے پہلے حقیقی دانشمند تھے قاعدتاً عرفان سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس آپؑ کو عرفان سے اس وجہ تعلق تھا کہ علامہ "زمخشری" نے اپنی کتاب "ربیع الابرار" میں

آپ کے غیر معمولی علمی مقام کے تذکرہ کے بعد آپ کو عرفان کا پیشرو تسلیم کیا ہے۔

تذکرۃ الاولیاء کے مولف "عطار" نے بھی جو ایک مشہور عارف تھے امام جعفر صادقؑ کو عرفان کا پیشرو مانا ہے لیکن تاریخی حیثیت سے " زمخشری " کا قول "عطار" کی تحریر کے مقابلے میں زیادہ وزنی اور وقیع ہے اس لئے کہ "تذکرۃ الاولیاء" کی بعض روایات تاریخ و وقوع کے لحاظ سے غیر مربوط ہیں، خود مولف بھی جذبے کی حالت میں لکھتے تھے اور چونکہ عرفاء کے عاشق تھے لہٰذا اس طرف متوجہ نہیں تھے کہ ان میں سے کسی کسی کے بارے میں انہوں نے غلو سے کام لیا ہے، کیونکہ اگر متوجہ ہوتے تو غلو سے کام نہ لیتے یہ جانتے ہوئے کہ مبالغہ کلام کی قدر و قیمت کو گھٹا دیتا ہے اور اگر تاریخ میں مبالغہ داخل ہوجائے تو اسے تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔ " زمخشری " کا قلم ایک مورّخ کا قلم تھا جب کہ "عطار" کے قلم کو ہم ایک عاشق کا قلم کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال بعض مورّخین اور عرفاء اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ دنیائے اسلام کے پہلے عارف یا عالمِ اسلام کے عرفاء سابقین میں سے ہیں کیا امام جعفر صادقؑ کے پہلے عارف یا دنیائے اسلام کے عرفاء سابقین میں ہونے کی رو سے غیر مسلم طالب علموں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ آپ کے درس میں شریک ہوکر آپ کے علم سے استفادہ کریں؟ کیونکہ بعض ماخذ اس بات کی نشاندھی کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے درس میں صابی مذہب کے پیروکار بھی موجود تھے۔ صابی وہ قوم تھی جس نے یہودیوں اور عیسائیوں کے عقائد کو مخلوط کرکے ایک دین بنا لیا تھا اور جو موحّدین میں شمار ہوتے تھے لیکن ان میں سے بعض مشرک بھی تھے جنہوں نے فروغِ اسلام کے بعد اپنے آپ کو موحّد ظاہر کیا تاکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرسکیں ہمیں اس بات کا علم ہے کہ مسلمان، موحّدین کے فرقوں کو جنہیں وہ اہلِ کتاب کہتے تھے، تکلیف نہیں دیا کرتے تھے۔

صابئین کا مرکزِ سکونت "حران" تھا جو جنوبی بین النہرین کے مغرب میں واقع تھا اور جسے یورپ کی قدیم تاریخوں میں "کارہ" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ خدائے واحد کی پرستش کرنے والے صابئین کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ نوزائیدہ بچے کی پیدائش کے بعد

میں سے بعض افراد کی عرفانی زندگی میں شطح اور طامہ (صوفیت کی اصطلاحیں) اس حد
تک پہنچا کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے برابر سمجھ لیا۔ اور ایسا بے سبب نہیں تھا کہ
زمخشری جیسے مشہور عالم ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔

البتہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان چونکہ مبالغے سے پاک تھا لہٰذا نہ صرف شیعہ مذہب
کے عارفین نے اس کی پیروی کی بلکہ اہلسنّت عرفاء کی ایک جماعت نے بھی آپؑ سے
اس کا درس لیا ہے۔ اور آپؑ کے دو سو سال بعد خلفائے بنی عباس کے مرکز بغداد میں
سنّی عارف آپؑ کے عرفان کی پیروی کرتے تھے۔ حالانکہ اسلام میں عرفان کے بانی کو
انہیں عباسی خلفاء میں سے ایک خلیفہ نے قتل کیا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کا عرفان ذاتِ خداوندی پر توکّل اور اس کے احکام کو اس طرح بجا
لانا ہے کہ دنیاوی امور سے غفلت نہ برتی جائے جس سے زندگی کا نظام درہم برہم ہو
جائے۔

عطار نیشاپوری تذکرۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ بایزید بسطامی نے بزرگ عارفین کی
خدمت میں پہنچنے کے لئے تیس سال تک بیابانوں کی خاک چھانی ہے اور بھوک و پیاس
کی مصیبت جھیلی، یہاں تک کہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہنچے، اس چیز کی طرف
متوجہ نہیں تھے کہ امام جعفر صادقؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بایزید بسطامی مکمل طور پر
دنیاوی زندگی سے لاتعلق ہو جائیں اور تیس سال تک بھوک و پیاس کی زحمت اٹھائیں،
لہٰذا اگر امام جعفر صادقؑ کے حضور بسطامی کے پہنچنے والی روایت صحیح ہوتی تو بانیٔ عرفان
امام صادقؑ ضرور انہیں تنبیہہ اور ملامت کرتے اور فرماتے کہ تم نے کس لیے تیس
سال جنگلوں اور بیابانوں میں بسر کئے اور کیوں اپنے اہل و عیال کے حق میں اپنی ذمّہ
داری پوری نہ کی؟ اس لئے کہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان ترکِ دنیا کا حامی نہیں ہے۔
آپؑ فرماتے ہیں کہ ہر شخص کو امورِ آخرت کے ساتھ ساتھ اپنے دنیاوی معاملات بھی
درست رکھنا چاہیے۔ امام جعفر صادقؑ کے عرفان میں آپؑ کے بعد آنے والے متعدّد
عرفانی مکاتیب کی طرح خدا تک پہنچنے کا مسئلہ موجود نہ تھا۔

آپؑ یہ نہیں کہتے کہ انسان خدا تک پہنچ جائے گا مگر ان حدود میں جو قرآن نے
بتائے ہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان خدا کے لئے ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر
جائے گا لیکن اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خدا ہو جائے گا۔ انسان جو مخلوق
ہے ہمیشہ مخلوق ہی رہے گا اور یہ ہرگز خدا نہیں ہو سکتا، البتہ مرنے کے بعد چونکہ خدا
کی طرف پلٹ جائے گا لہٰذا اس سے نزدیک تر ہو جائے گا۔ امام جعفر صادقؑ کے بعد
دوسرے عرفانی مکاتب نے انا للہ و انا الیہ راجعون سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب انسان
مرنے کے بعد خدا سے ملحق ہو جاتا ہے اور خدا ہو جاتا ہے تو اپنی زندگی میں کیوں خدا
نہیں ہو سکتا؟ مرنے کے بعد خدا ہونے کے عقیدے سے یہ نظریہ پیدا ہوا کہ مرنے کے
بعد جب انسان خدا سے پیوست ہو جاتا ہے تو پھر وہ زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ وہ ہر چیز
سے آگاہ ہوتا ہے اس دنیا کے حالات کا بخوبی مشاہدہ کرتا ہے۔ اپنے اعزّہ و اقربا کو دیکھتا
ہے اور ان کی مشکلات کو حل کرتا ہے۔ مرنے کے بعد زندہ رہنے کا عقیدہ صرف
مسلمانوں ہی کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ تمام قدیم ادیان میں پایا جاتا ہے۔ ہمیں پچھلے ادیان
میں صرف دو کے علاوہ اور کوئی ایسا دین نہیں ملتا جس میں انسان کے مرنے کے بعد زندہ
رہنے کا عقیدہ موجود نہ ہو یہاں تک کہ جن مذاہب کے پیرو مردے کو جلا کر اس کی
خاک دریا میں بہا دیتے ہیں وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ مردہ دوسری دنیا میں زندہ ہے
صرف مانوی مسلک کے لوگ اور باطنی فرقے کے پیرو جو اسماعیلی مذہب سے تعلق رکھتے
تھے یہ کہتے تھے کہ انسان مرنے کے بعد بالکل فنا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں فرقے
قیامت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ البتہ حسن صباح کے بعد باطنی مذہب کے داعی اس بات کی
طرف متوجہ ہوئے کہ ان کے پیروؤں کو معاد، حیات بعد الموت اور پاداشِ عمل یا
دوسری دنیا میں سزا و جزا ملنے پر عقیدہ رکھنا چاہیے۔ یہاں تک کہ ایک باطنی اور وجدانی
نگران بھی ہر شخص کے ساتھ رہے تاکہ اسے برے افعال سے باز رکھنے کی کوشش
کرے۔ ان دونوں فرقوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو سارے ادیان میں کسی نہ
کسی طرح معاد کو تسلیم کیا گیا ہے تاکہ ایک وجدانی اور باطنی نگراں موجود رہے۔

ان میں سے بعض کے اندر مثلاً قدیم مصر میں پاداش اور سزا و جزا کے لئے جسمانی موت کے بعد فوراً بلا فاصلہ دوسری زندگی شروع ہو جاتی تھی اور بعض دوسروں کے نزدیک اس دنیا کی موت اور دوسری دنیا میں جزا و کیفرِ کردار کے درمیان میں کچھ وقفہ یا فاصلہ پایا جاتا ہے یہاں تک کہ وحشی قبائل میں بھی حیات بعد الموت کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ انسان مرنے کے بعد پھر زندہ نہ ہو گا۔ دریائے نیل کے سرچشموں کا انکشاف کرنے والا "ڈاکٹر لیونگ اسٹون" جس نے انیسویں صدی عیسوی میں اپنا سفرنامہ اور انکشافات کی تفصیل حکومتِ انگلستان کی شاہی انجمن جغرافیہ (Royal Society of Geography) کے سامنے پیش کی تھی' مرکزی افریقہ میں اپنی طولانی سکونت کے دوران ہر قبیلے کے ساتھ رہا اس نے غور کیا کہ ہر قبیلہ اپنے مرے ہوئے اجداد کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے۔ان میں سے بعض قبائل اپنے اجداد کے ارادے اور نظریئے کو اپنی زندگی کے امور میں موثر جانتے ہیں۔ افریقی قبائل کے بعض جادوگر اپنے اجداد کے ارادے اور نظریات کو اپنی قوم کے لئے تعین کرتے ہیں۔

لیونگ اسٹون نے مرکزی افریقہ میں جو دیکھا اور سنا نیز دیگر اشخاص نے مختلف علاقوں میں جو کچھ مشاہدہ کیا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تمدن کے لحاظ سے جو قبیلہ جس قدر پس ماندہ ہوا ہے اسی قدر اس کے اندر حیات بعداز موت کا اعتقاد زیادہ قوی ہے۔ لیکن یہ مطلب نہیں کہ متمدن اقوام حیات بعد الموت کے معتقد نہیں آج امریکہ اور فرانس کے لوگ بھی حیات بعد الموت کے قائل ہیں۔ لیکن ان کا عقیدہ افریقہ کے سیاہ فام قبائل کے عقیدے سے مختلف ہے سیاہ فام قبائل کے عقیدہ میں حیات بعد الموت اس کی دنیاوی زندگی کے عین مشابہ ہے جب کہ ایک امریکی یا فرانسیسی یہ نہیں کہتا کہ مرنے کے بعد وہ دوسری دنیا میں اسی طرح کھانا کھائے گا' لباس پہنے گا اور فلم دیکھنے سینما ہال جائے گا۔ اسی لئے بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ حیات بعد الموت کا عقیدہ بشر کے لئے ایک فطری عقیدہ ہے اگرچہ اس میں حیاتیات یا اعضاء و جوارح کے نظام

عمل کا اصول کار فرما نہیں' جو بھوک وپیاس کی طرح ناقابلِ اجتناب ہو پھر بھی چونکہ یہ عقیدہ جیسا کہ آثارِ قدیمہ کی رو سے سمجھ میں آتا ہے قدیم ترین دور میں بھی موجود تھا اور ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں سال سے اسلاف سے اخلاف کی طرف منتقل ہوتا رہا ہے لہٰذا اس طرح سے جڑ پکڑ چکا ہے کہ انسان کی فطرت کا جزو بن گیا ہے اور صرف وہی شخص اس عقیدہ کا منکر ہو سکتا ہے جس نے ہرگز کسی معاشرے کی صورت نہ دیکھی ہو۔ قوم کے افکار و عقائد اس کے کانوں تک نہ پہنچے ہوں۔

عقیدۂ معاد رکھنے والے تمام مذاہب میں معاد کی بنیاد حیات بعد الموت کے اسی فطری عقیدہ پر قائم ہے۔ عقیدۂ معاد رکھنے والے ہر مذہب نے حیات بعد الموت کے اس فطری عقیدہ سے لوگوں میں باطنی اور وجدانی نگراں کی تقرری کے لئے ایک خاص انداز میں استفادہ کیا ہے۔قدیم مصر میں اگر کوئی چوری کرتا تھا'علاوہ اس کے کہ اسے دنیا میں جاری قوانین کے مطابق سزا ملتی دنیائے مغرب یعنی دوسری دنیا میں بھی وہ ہمیشہ تاریکی میں رہتا اور سورج کی روشنی سے بھی محروم کر دیا جاتا اور نہ وہ کسی چراغ ہی سے استفادہ کر سکتا تھا۔(۱)

زردشتی عقیدہ کے مطابق موت کے بعد دنیا میں آدمی کو "چنوند" کے پل سے گزرنا ہو گا۔ اگر اس دنیا میں اس نے خلافِ قانونِ الٰہی عمل کیا ہو گا تو وہ اس پل کو پار نہیں کر سکے گا اور گر کر واصلِ جہنم ہو گا۔

مشرق کے عرفانی مکاتب نے مسلمانوں کے حیات بعد الموت کے فطری اور مذہبی عقیدے سے اثر قبول کیا اور انہوں نے اپنے پیروؤں کی روحانی تربیت کے لئے ایک مناسب میدان یا ہموار راستہ پالیا۔ انہیں اس کی ضرورت نہیں ہوئی کہ اس روحانی تربیت کے لئے مقدمات کا درس شروع کریں اور ایک مدت تک محنت کر کے اپنے

۱۔ قدیم مصر میں (آج کی طرح) تمام شہر دریائے نیل کے کنارے آباد تھے اور تمام قبرستان دریا کے مغربی حصے میں واقع تھے۔ اسی لئے موت کے بعد کی دنیا کو "دنیائے مغرب" کہا جاتا تھا۔

مریدوں کو یہ سمجھائیں کہ آدمی مرنے کے بعد زندہ رہتا ہے لٰہذا انہیں کوشش کرنا چاہئے کہ دوسری زندگی میں بلند ترین مرتبہ حاصل ہو۔ یہ کام عرفان کا پہلا زینہ تھا لیکن عارفین نے دوسری ہجری کے آخر سے اس منزل سے بلند ہو کر عرفان کی بنیاد اس چیز پر رکھی کہ آدمی اس دنیا میں بالا ترین مرتبے تک پہنچ جاتا ہے اور جس چیز نے اس خیال کو جنم دیا یہی حیات بعد الموت کا عقیدہ تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر مسلمان یا دیگر قومیں حیات بعد الموت کی قائل نہ ہوتیں تو عرفان وجود ہی میں نہ آتا کیونکہ اس کی کوئی بنیاد نہ ہوتی۔ عرفاء کہتے ہیں کہ آدمی بلاشبہ مرنے کے بعد زندہ رہتا ہے اور موت تبدیلیٔ لباس کے سوا کچھ نہیں لٰہذا انسان دنیا میں روحانی ارتقاء کے بلند ترین مرتبے تک کیوں نہ پہنچے؟ اپنے کو ملکوت تک پہنچائے اور صبر کرے یہاں تک کہ مرنے کے بعد ترقی کی آخری منزل پر فائز ہو جائے؟ متعدّد عرفانی مکاتب کا مقصد یہ تھا کہ انسان اسی دنیاوی زندگی میں اپنے کو ملکوت تک پہنچا دے اور جب ہم اس کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عرفان کا مقصد یہ ہے کہ انسان اسی دنیا میں اور مرنے سے پہلے ہی اپنے کو خدائی درجے تک پہنچا دے لیکن امام جعفر صادقؑ کے عرفان کا موضوع یہ نہیں ہے اور آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ انسان اسی دنیاوی زندگی میں اپنے آپ کو مرحلۂ خدائی تک پہنچا دے۔ یہ عقیدہ امام جعفر صادقؑ کے بعد آنے والے عرفانی مکاتیب کی ایجاد ہے اور دو چیزوں نے اس عقیدہ کو عرفانی مکاتب میں جگہ دی۔ ایک حیات بعد الموت کا تصور اور دوسرے وحدتِ وجود۔ وحدتِ وجود کا نظریہ جو امام جعفر صادقؑ کے بعد مشرق میں عرفانی مکاتب کا دوسرا عظیم ستون بنا بلاشبہ مشرق سے نکلا ہے اور اس کا سرچشمہ ہندوستان و ایران میں ہے۔ پھر یہ یورپ تک پہنچا اور وہاں اپنے طرف دار پیدا کئے۔ امام جعفر صادقؑ وحدتِ وجود کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور مخلوق کو خالق سے الگ سمجھتے تھے۔ جو لوگ وحدتِ وجود کے حامی تھے وہ کہتے تھے کہ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی تفاوت نہیں علاوہ ایک جہت کے یعنی شکل اور لباس کے لحاظ سے اور جمادات و نباتات اور حیوانوں میں سے جو بھی ہے

وہی خدا ہے کیونکہ آغاز میں خدا کے سوا اور کچھ نہ تھا اور چونکہ دنیا کا آغاز و انجام نہیں لٰہذا اب بھی خدا کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور چونکہ خدا کے سوا کوئی تھا اور نہ ہے اس لئے خداوندِ عالم نے ناگزیر طور پر جمادات، نباتات اور حیوانات کے تخلیقی عناصر کو اپنے اندر سے نکالا ہے لٰہذا خدا اور اس کی خلقت کے درمیان ماہیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

---☆---☆---
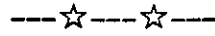
امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کی تشکیل کی

جب کوئی انسان روحانی کرب میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت وہ اپنی ہستی کو فراموش نہیں کر سکتا اور وہ روحانی کرب اسے مستقل طور پر متوجہ کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔

اجسام کے شفاف اور غیر شفاف ہونے کے بارے میں امام جعفر صادقؑ نے جو قانون دریافت کیا وہ بھی اتنا سہل و آسان تھا کہ سب ہی نے اسے قبول کیا اور چونکہ اسے یاد رکھنے میں کوئی دشواری نہیں تھی اس لئے وہ بہت جلد ہی افریقہ اور ایشیاء کی مسلمان قوموں کے درمیان مشہور ہوا۔

آپؑ نے مذہبِ شیعہ کی دو طریقوں سے خدمت کی۔

ایک تو یہ کہ آپؑ نے علوم کی تدریس کے ذریعہ اہلِ تشیع کو دانشمند بنایا جس کے سبب ایک شیعی ثقافت وجود میں آئی۔ شیعی ثقافت کے وجود میں آنے سے اس مذہب کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور ہمارے خیال میں یہ بات واضح و روشن ہے کہ ہر قوم اور ہر طبقہ کے افراد کے لئے ان کی ثقافت' ان کی تقویت کا باعث ہوتی ہے۔ (یونان کی طرح) بعض قدیم قومیں آج بھی اس لئے باقی ہیں کہ وہ ایک پسندیدہ ثقافت کی حامل ہیں وگرنہ آج وہ بھی آہستہ آہستہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتیں اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا۔

امام جعفر صادقؑ سے قبل شیعہ حضرات دو صاحبِ علم اماموں کے وجود سے فیضیاب ہوئے جن میں سے ایک ہستی آپؑ کے والدِ بزرگوار امام محمد باقرؑ کی تھی۔

لیکن شیعی ثقافت کے لئے آپؑ میں سے کسی نے کوئی بنیاد قائم نہیں کی اور اس کی اہمیت پر توجہ نہیں دی اس کے علاوہ علمی اعتبار سے بھی ان ہستیوں کا امام جعفر صادقؑ سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

امام جعفر صادقؑ نے محسوس کیا کہ مذہبِ شیعہ کے لئے ایک معنوی اساس کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ ادوار میں کسی کے آنے اور کسی کے جانے سے اس مذہب پر کوئی آنچ نہ آسکے۔ آپؑ تدریس کے شروع دن ہی سے اپنا لائحہ عمل جانتے تھے۔

شیعی عقائد کی تشکیل کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جو تدریجی طور پر آپؑ کے ذہن میں آیا ہو۔آپؑ اچھی طرح جانتے تھے کہ شیعہ مذہب کو باقی رکھنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کے لئے ایک ثقافت تشکیل پائے۔

یہ بات واضح کرتی ہے کہ یہ شخصیت نہ صرف علمی لحاظ سے فہم و فراست کی حامل تھی بلکہ آپؑ کو سیاسی تدبر بھی حاصل تھا۔ اور آپ جانتے تھے کہ مذہبِ شیعہ کی تقویت کے لئے کسی ثقافت کی تشکیل طاقت ور فوج تیار کرنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ ایک طاقت ور فوج ممکن ہے اپنے سے زیادہ طاقتور فوج کے ہاتھوں مغلوب ہو جائے مگر ایک مضبوط' محکم اور وسیع ثقافت ہرگز تباہی کا شکار نہیں ہو سکتی۔

آپ نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ اس ثقافت کو جلد از جلد وجود میں آجانا چاہئے تاکہ وہ ان تمام فرقوں پر فوقیت رکھے جو اسلام میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ اور ابھی ثقافت سے ان کا دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔

جس وقت امام جعفر صادقؑ نے ارادہ فرمایا کہ شیعہ مذہب کے لئے ایک ثقافت کی تشکیل کریں اس وقت کسی فرقہ کے بانی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ ان کے لئے ایک ثقافت کی تشکیل ضروری ہے آپؑ نے یہ بات محسوس کی کہ ایک خاص ثقافت کی تشکیل کے بغیر مذہبِ شیعہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اس کو باقی رکھنے کے لئے

شیعی ثقافت کا اثر و نفوذ ضروری ہے۔ اور بعد کے واقعات نے بتایا کہ امام جعفر صادقؑ کا نظریہ درست تھا۔ کیونکہ بارہویں امامؑ کے بعد اہلِ تشیع کے پاس کوئی ایسا مرکز نہیں تھا جس کے گرد وہ جمع ہو جاتے اور باوجود اس کے کہ کلیسا کی طرح وسیع سازو سامان کے ساتھ ان کا کوئی دائمی روحانی مرکز نہیں تھا اور آج بھی امام جعفر صادقؑ سے ساڑھے بارہ سو سال گزرنے کے بعد جب کہ چرچ کی طرح ان کے پاس کوئی وسیع روحانی مرکز موجود نہیں ہے، مذہبِ شیعہ باقی ہے اور برابر پروان چڑھ رہا ہے۔ اور یہ اسی ثقافت کا فیضان ہے جسے امام جعفر صادقؑ نے رائج کیا اور آثار ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اس کے بعد بھی باقی رہے گا۔

ظاہر ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد آنے والے شیعہ دانش مندوں نے اس ثقافت کو آگے بڑھایا لیکن آپؑ نے نہ صرف یہ کہ اس کی بنیاد استوار کی بلکہ اس کی شیرازہ بندی بھی آپؑ ہی کے ہاتھوں انجام پائی۔

امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کو رائج کر کے شیعہ علماء کو اس کی ضرورت کا احساس دلایا اور انہیں سمجھایا کہ جو چیز اس مذہب کی بقا کی ضامن ہے وہ اس کی ثقافت ہے لٰہذا ہر دانش مند پر لازم ہے کہ وہ اس کی توسیع کرے اور اگر وہ اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا تو اسے چاہئے کہ وہ دوسروں سے پہنچی ہوئی باتوں ہی کی حفاظت کرے اور انہیں لوگوں میں ترویج دے۔

ممکن ہے کہا جائے کہ یہ اہتمام فقط شیعہ مذہب سے اختصاص نہیں رکھتا بلکہ دوسرے مذہب والے بھی یہی اہتمام رکھتے ہیں۔ ہم ان کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں مذہبی پیشواؤں کا اہتمام فقط مذہبی طور طریقوں کی حفاظت تک محدود ہوتا ہے نہ کہ اس کی توسیع و ترویج۔

یونان کے کوہِ ایتھس پر واقع پندرہ سو سالہ قدیم آرتھوڈکسی چرچ میں آج بھی وہی اندازِ سخن ہے جو پندرہ سو سال قبل ہوا کرتا تھا۔ لیکن شیعی ثقافت مجموعی طور پر ہمیشہ آگے بڑھتی رہی اگرچہ بعض ادوار میں اسے کہیں رکنا پڑا لیکن اس رکاوٹ کے دور

ہونے کے بعد اس نے پہلے سے زیادہ سرعت کے ساتھ ترقی کی اور گہری نظر رکھنے والے شیعہ علماء کی یہی کوشش رہی کہ وہ اس ثقافت کو اور بلندی عطا کریں۔

اگر ہم دوسری صدی عیسوی کو انطاکیہ کے آرتھوڈکس چرچ کی رونق کا دور جانیں تو اس مذہب کو جسے عیسائیوں کا سچا مذہب سمجھا جاتا ہے تقریباً اٹھارہ سو سال کا عرصہ گزرتا ہے اور ان اٹھارہ صدیوں میں اس مکتبِ فکر نے کوئی ترقی نہیں کی۔ آج اس کا علمی سرمایہ بس اتنا ہی ہے جتنا اٹھارہ سو سال قبل انطاکیہ میں تھا۔

اگرچہ کئی بار آرتھوڈکس کی عالمی کونسل کا انعقاد ہوا اور اس مذہب کے بڑے بڑے پادری اطراف و اکنافِ عالم سے ایک جگہ جمع ہوئے لیکن ان مشاورتی مجالس میں کوئی نیا قانون وضع نہیں ہوا اور ان کی ثقافت کو کوئی بلندی حاصل نہ ہو سکی۔

فرانس کے مشہور و معروف محقق، ادیب اور مورخ "ڈانیل روپز" کا کہنا ہے کہ کیتھولک ثقافت ایک ہزار سال تک جامد رہی اور اس نے کسی قسم کی ارتقائی منازل طے نہ کیں۔ اس عرصے میں کیتھولک علماء کا کام فقط اپنی سنّت اور رائج طور طریقوں کی حفاظت تھا۔

اس مورخ کا کہنا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک کیتھولک عقائد جمود کا شکار رہے اور اس مکتبِ فکر کے حامل افراد سولہویں صدی عیسوی میں وہی کچھ کہتے رہے جو وہ چھٹی صدی عیسوی میں کہا کرتے تھے۔ اس ہزار سال کے عرصے میں بہت سے زاہد و متقی مرد اور عورتوں نے دنیا میں قدم رکھا جن کا نام آج بھی ہر مذہبی تاریخ میں درج ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ کوشش نہیں کی کہ اپنی ثقافت کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دورِ جدید نے نہ صرف یہ کہ یورپ میں علم و ہنر کو رونق بخشی بلکہ اس نے کیتھولک عقائد کی توسیع بھی کی اور ایسی نمایاں شخصیات کو جنم دیا جنھوں نے اپنی ثقافت کو پروان چڑھایا۔

کیتھولک ثقافت کو آگے بڑھانے والے تمام کے تمام مذہبی رہنما نہ تھے بلکہ ان میں غیر مذہبی افراد کا دخل زیادہ رہا ہے۔

یہی ڈانیل روپز' جس کا تذکرہ ابھی ہم کر چکے ہیں' کوئی مذہبی آدمی نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے تاریخِ مسیحیت پر جو کتابیں لکھی ہیں اور کیتھولک عقائد کو جو ترقی دی ہے وہ اس قدر مقبول ہے کہ فرانس' اسپین اور اٹلی جیسے کیتھولک مذہب کے حامل ممالک میں آج کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس میں ڈانیل روپز کی کم سے کم ایک کتاب اصل یا ترجمہ کی صورت میں موجود نہ ہو۔

انیسویں صدی عیسوی کا مشہور و معروف فرانسیسی فلسفی "ارنسٹ رنان" جس کی "مسیح" نامی کتاب کیتھولک دنیا کی سب سے عظیم یادگار ہے' مذہبی پیشوا نہیں تھا بلکہ فلسفی ہونے کی حیثیت سے کیتھولک چرچ کے پادری اس سے زیادہ خوش نہ تھے تاہم اس نے کتاب کے ذریعے کیتھولک مذہب کی بڑے مؤثر انداز میں خدمت کی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آرتھوڈکس اور کیتھولک دونوں مذاہب کے پاس اپنے اپنے چرچ تھے۔ لیکن آج آرتھوڈکس گرجوں پر بیکسی کا عالم طاری ہے۔ جب کہ کیتھولک چرچ دنیا کے ثروت مند ترین اداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ روم میں واقع کیتھولک چرچ کی دولت کا اندازہ ایک لاکھ ملین ڈالر کیا گیا ہے۔ دنیا کا کوئی بینک یا اقتصادی ادارہ اتنی دولت کا حامل نہیں۔

پہلے بھی کیتھولک چرچ جن کا مرکزی مقام روم تھا' وافر سرمایہ کے حامل تھے اور وہ اس سرمایہ کے ذریعہ اپنی ثقافت کو آگے بڑھا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور ہزار سال کی مدت میں ایک گام بھی آگے نہ بڑھے۔

لیکن اہلِ تشیع کے پاس کوئی مرکزی دینی و مذہبی انجمن یا ادارہ موجود نہیں تھا اس کے علاوہ ان کے علماء کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنے مکتبِ فکر کو عروج دے سکیں تاہم انہوں نے جنگ اور تبدیلیِ سلطنت (کے ہنگامی حالات) کے علاوہ باقی تمام ادوار میں ترقی کی اور اپنی ثقافت کو آگے بڑھایا۔

ان سب باتوں سے ہماری مراد اس حقیقت کو آشکار کرنا ہے کہ تمام مذاہب کے علماء مذہبی ثقافت کو ترقی دینے میں کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔ اور آج بیسویں صدی

میں وہ اس پر توجہ دے رہے ہیں۔ اگرچہ آرتھوڈکس اور کیتھولک دونوں مذاہب کے لوگ گزشتہ ادوار میں اس فکر سے آزاد تھے۔ اور فقط اپنی سنّت کی حفاظت کو اپنا نصب العین جانتے تھے۔ یہ لوگ بدعت کے خوف سے اپنی ثقافت کی توسیع سے اجتناب کرتے تھے۔

لیکن مذہبی ثقافت کی توسیع بدعت نہیں ہے جیسا کہ پندرہویں صدی عیسوی سے آج تک کیتھولک ثقافت میں جو توسیع ہوئی ہے اس میں بدعت کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔

ایک ہزار سال تک ثقافت کی توسیع سے اجتناب کیتھولک پیشواؤں کی فطرت بن گئی تھی۔ اور وہ آرتھوڈکس پیشواؤں کی طرح اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتے تھے۔

پندرہویں صدی عیسوی کے بعد کیتھولک ثقافت میں جو "دورِ تجدّد" وجود میں آیا اس کا آغاز امام جعفر صادقؑ نے اہلِ تشیع کے لئے ساتویں صدی عیسوی ہی میں کر دیا تھا۔ آپؑ نے شیعہ مفکرین اور علماء کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ حسبِ استعداد شیعی ثقافت کی توسیع میں کوشاں رہے کیونکہ یہی وہ عمل ہے جو شیعی مکتبِ فکر کی بقاء کا ضامن ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں اہلِ تشیع کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ زبردستی صاحبِ قدرت بنیں۔

عربستان اور اس کے باہر کے علاقوں میں مذہبِ جعفری کے پیروکار بہت محدود سوسائٹی کے حامل تھے۔ اور ان میں سے بعض سوسائٹیاں تو صرف اپنے خاندان ہی کے چند افراد پر منحصر تھیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ یہ قدرت نہیں رکھتے تھے کہ اموی حکام پر غالب آ سکیں۔ امام جعفر صادقؑ دیکھ رہے تھے کہ اہلِ تشیع کسی سیاسی طاقت کے حامل نہیں ہیں اور حالات بھی اس طرح کے تھے کہ وہ مستقبل قریب میں سیاسی طاقت بن کر نہیں ابھر سکتے تھے لہٰذا شیعہ مذہب کی توسیع و ترقی کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ اس مکتبِ فکر کو تقویت پہنچائی جائے اور آئیڈیالوجی کے ذریعہ اسے چار

دانگِ عالم میں پھیلایا جائے اور کیونکہ اس وقت تک کسی اسلامی فرقہ نے اپنے عقائد کی باقاعدہ طور پر تشکیل نہیں کی تھی لہٰذا جو بھی اس میں سبقت کرتا وہ دوسروں سے آگے بڑھ جاتا اور اپنی پیش قدمی کو جاری رکھ سکتا تھا۔

امام جعفر صادقؑ نے اپنے ماننے والوں کے لئے کوئی انجمن قائم نہیں کی اس لئے کہ یہ اقدام ذوقِ عرب سے ہم آہنگ نہ تھا لیکن آپؑ نے ان کے لئے ایک اکیڈمی کی تشکیل کی۔(۱)

گرجوں کی تعمیر کرنے والے عیسائیوں نے اداروں کی تشکیل کے ذوق کو رومیوں سے سیکھا۔ قدیم رومی، قوانین وضع کرنے اور ادارے قائم کرنے کے شوقین تھے۔ آرتھوڈکس اور کیتھولک گرجوں کی تعمیر انہیں کے انجمن ساز ذوق کا نتیجہ ہے۔

شیعہ مذہب کے لئے امام جعفر صادقؑ کے قائم کردہ علمی مرکز نے اکیڈمی کی صورت اختیار کی جس میں آزادانہ طور پر علمی مسائل کو موضوعِ بحث بنایا جاتا اور کھلے دل کے ساتھ آئیڈیالوجی پر گفتگو ہوتی۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی قائم کردہ ثقافت میں بحث و مباحثہ کی جو آزادی تھی وہ اسلام کے کسی فرقہ میں نہ تھی۔

۱۔ اکیڈمی، یونان کے شہر ایتھنز (Athens) کے قریب ایک باغ تھا جس میں افلاطون اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتا تھا۔ افلاطون کے بعد اس کے شاگردوں نے اس باغ کو اپنے مطالعات کا مرکز قرار دیا یہ اکیڈمی تقریباً ایک ہزار سال تک اور تحقیقات کے مطابق ۳۸۷ قبلِ مسیح سے ۵۹۲ بعدِ مسیح یعنی ۹۷۹ سال تک علمی مطالعاتی مرکز بنی رہی۔ یہاں تک کہ بیزانس (رومیہ الصغریٰ) کے بادشاہ "جوس تی نین" نے اس پر تصرف حاصل کیا۔ اس نے اس علمی مطالعاتی مرکز کو ختم کیا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے ایاصوفیہ کے گرجے کو بنایا جو آج بھی استنبول میں مسجد کی شکل میں موجود ہے۔ اس نے شہری قوانین کو ایک مجموعہ کی صورت دی جو ابھی تک "کوذجوس تی نین" قوانین کے نام سے مشہور ہے لیکن چونکہ اس اکیڈمی میں ایسے خیالات کا اظہار ہوتا تھا جو "جوس تی نین" کے عقیدے کے خلاف تھے اس لئے اس نے اس اکیڈمی کو ختم کردیا (فارسی مترجم)

شیعی ثقافت میں بحث و مباحثہ کی آزادی

امام جعفر صادقؑ کا مکتبِ فکر دیگر تمام مکاتبِ فکر سے اس لئے بھی ممتاز تھا کہ اس میں بحث کی کھلی آزادی تھی اور اسی خصوصیت کے باعث اسے وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔

ہم گزشتہ صفحات میں یہ بتا چکے ہیں کہ کیتھولک مذہب ایک ہزار سال تک جامد رہا اور آرتھوڈکس فرقہ اب بھی دوسری صدی عیسوی کے افکار و ثقافت کا پابند ہے۔

لیکن شیعی ثقافت کو امام جعفر صادقؑ نے اس طرح تشکیل دیا کہ ابھی دوسری صدی ہجری کا اختتام بھی نہ ہوا تھا کہ اس مذہب نے پھیلنا شروع کردیا، شیعی ثقافت نے صرف ترقی ہی نہیں کی بلکہ وہ دیگر تمام اسلامی فرقوں کے لئے ایک نمونہ بنا تاکہ وہ بھی اپنے عقائد میں بحث و مباحثہ کی گنجائش پیدا کریں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب میں بحث و مباحثہ کی آزادی اسکندریہ کے علمی مکتب سے شروع ہوئی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسکندریہ کے علمی مکتب میں فلسفہ پر آزاد بحث ہوا کرتی تھی نہ کہ مذہب پر۔ یہ علمی مکتب ساتویں صدی عیسوی تک قائم رہا اور عربوں کے مصر پر حملہ کے بعد غارت ہوگیا۔

اسکندریہ کے علمی مکتب میں فلسفہ کے بعد نجوم، طب، دواسازی، فزکس، کیمسٹری اور کسی قدر میکانکی علوم (MECHANICS) میں دلچسپی لی جاتی تھی لیکن مذہب سے

ان کی دلچسپیاں وابستہ نہ تھیں۔

اسکندریہ کے علمی مکتب کے بعض دانش مند یہودی یا عیسائی تھے لیکن وہ مذہبی مسائل کو علمی بحثوں میں نہیں لاتے تھے۔ کیونکہ یہ علمی مکتب لادینیت کے لئے مشہور تھا۔ اور اسی لئے اس میں مذہبی مسائل زیرِ بحث نہیں آتے تھے۔

سب جانتے ہیں کہ اسکندریہ کا علمی مکتب اس کتب خانے کے قیام سے عمل میں آیا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کتب خانہ کو مصر کے بادشاہ "بطلیموس اوّل" نے تعمیر کرایا تھا۔ جس کی سن وفات ۳۵۸ قبل مسیح ہے۔

یہ تعارف بھی محتاجِ تفصیل نہیں کہ مصر پر ڈھائی صدیوں تک حکومت کرنے والے سلسلہ بطالسہ کے بادشاہ جن کا پہلا حکمران "بطلیموس اوّل" تھا۔ نسلی اعتبار سے یونانی تھے اور یونان کے خداؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن بادشاہ ہونے کے باوجود ان کا مذہبی عقیدہ مکتبِ اسکندریہ کے علمی مباحث میں داخل نہ ہو سکا۔ اس علمی مکتب کا پہلا فارغ التحصیل دانش مند شکاک "پیرون" تھا۔

پیرون مستقل طور پر اسکندریہ کا رہنے والا نہ تھا لیکن وہ اس علمی مکتب کا تربیت یافتہ ضرور تھا۔ اور اس مکتب کی تاثیر نے اسے بری طرح شکی بنا دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ دنیا میں کسی حقیقت کا وجود محال ہے اس لئے کہ ایسا کوئی نظریہ نہیں جو کسی اور نظریہ سے رد نہ ہوتا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ پیرون کو مکتبِ اسکندریہ نے شکی نہیں بنایا تھا بلکہ یہ کیفیت اس میں فطری طور پر موجود تھی لیکن اس مکتب میں علمی بحث و مباحثہ کی آزاد فضا نے اس کی اس کیفیت کو ابھارا اور تقویت دی یہاں تک کہ وہ پورے طور پر حقیقت کا منکر بنا۔

اگر سلسلہ بطالسہ کے مصری بادشاہوں کا دین اسکندریہ کے علمی مکتب میں سرایت کرتا تو پیرون اتنی آسانی کے ساتھ ہر حقیقت کی تردید نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بطالسہ کے بادشاہوں کے مذہب میں یونانی خداؤں کا وجود ناقابلِ تردید تھا۔

اس مقام پر ہم پیرون کے فلسفہ پر بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ عمل ہمیں اصل

موضوع سے دور لے جائے گا۔ ہمارا مدعا صرف یہ بتانا ہے کہ اسکندریہ کے علمی مکتب میں مذہبی امور پر گفتگو نہیں ہوتی تھی کیونکہ یہ مکتب علمی مباحث کے اعتبار سے لادین تھا۔

مذہبی مسائل پر بحث کی آزادی کا آغاز اس وقت ہوا جب امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کی بنیاد ڈالی۔ اس مکتبِ فکر میں مذہبی مباحث، علمی مباحث میں شامل ہونے لگے اور اس کے بعد اس کا جز بن گئے۔ اس کے بعد کی صدیوں میں شیعہ علماء نے اس مذہب کو علمی قوانین سے ثابت کیا اور یہ روش آج بھی جاری ہے۔

شیعہ مذہب کی اس جدت کو بعد میں دوسرے مذاہب نے بھی اپنایا اور انہوں نے بھی اپنے مذاہب کی حقانیت کو علمی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔

یہ بات سب پر واضح ہے کہ کسی مذہب نے اپنی سچائی کے لئے اپنے آغاز ہی سے علمی دلائل کو پیش نظر نہیں رکھا۔ دینِ اسلام بھی آغاز میں دینِ مسیح اور دینِ موسیٰؑ کی طرح علمی دلائل پر متکی نہ تھا۔ اور آج جب کہ دینِ موسیٰؑ کو ۳۰، دینِ مسیح کو ۲۰ اور دینِ اسلام کو ۱۴ صدیاں بیت چکی ہیں، بیشتر اہلِ نظر کا یہ خیال ہے کہ دین کو علمی استدلال سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس کا تعلق قلب و احساس سے ہے۔

تمام آرتھوڈکس علماء اسی نظریہ کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ کیتھولک علماء کی کثیر تعداد بھی اسی طرزِ فکر کی حامل ہے اور دین کو علم سے الگ رکھنا چاہتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ دین ایک ایسا نظریہ ہے جس کو علم سے ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس لئے کہ اگر احکامِ دین علمی استدلال سے ثابت نہ بھی ہوں تب بھی ان کے نزدیک دین کی حقانیت پر کوئی آنچ نہیں آتی اس لئے کہ دینِ مسیح کا سرچشمہ عشق ہے نہ کہ علم۔ بالفاظ دیگر اسے عقل سے سروکار نہیں بلکہ عشق اس کا سرچشمۂ حیات ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کے دینی مدرسوں میں صدیوں تک علوم کی تدریس نہیں ہوتی تھی کیونکہ ان کے عقیدے میں دین کا مصدر علم نہیں تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں کلاسیکی مواد کے علاوہ مذہبی تعلیمات اور مسیحی فقہ کو بھی دستور یا

قانون کے نام سے دروس میں شامل کر لیا گیا اور یہ سلسلہ آج بھی ان مدارس میں خاص طور سے کیتھولک تعلیم گاہوں میں رائج ہے۔

پس عیسائیوں کے دینی مدرسوں میں جس علم کی تدریس ہوتی تھی اس کا تعلق فقط قانون یا مذہبی حقوق سے تھا۔ فزکس، کیمسٹری، نجوم، ہندسہ، طب، میکانکی علوم (MECHANICS) کے لئے ان مدرسوں کے دروازے پورے قرونِ وسطٰی میں بند تھے۔ اس کے علاوہ وہاں فلسفہ کی تعلیم بھی ممنوع تھی کیونکہ وہ لوگ ان علوم کو ضرر رساں جانتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ وہ پہلا مذہبی مکتب تھا جس میں فلسفہ کے ساتھ ساتھ ان دیگر علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ امام جعفر صادقؑ خود ان علوم کی تدریس فرماتے تھے۔ حالانکہ ابھی عربی زبان میں یونانی حکماء کی کتابوں کے ترجموں نے اتنی وسعت حاصل نہیں کی تھی۔

اس بات کا قوی احتمال ہے کہ یونانی حکماء کے فلسفی نظریات بھی بعض قبطی دانشوروں کے ذریعہ مصر کے راستے مدینہ اور پھر امام جعفر صادقؑ تک پہنچے ہوں۔ یہ قبطی دانشور مکتبِ اسکندریہ میں آزاد بحث کے پیروکار (حامی) تھے۔ اور یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ تمام قبطی پیشواؤں کو فلسفہ سے دلچسپی نہیں تھی۔

وہ تمام کے تمام عیسائی آرتھوڈکس فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے نزدیک فلسفہ ایک ضرر رساں علم تھا۔

بہرحال فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے قبطی علماء کی تعداد بہت مختصر تھی پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ ان ہی کے توسط سے مدینہ پہنچا ہوگا۔ اسلام میں امام جعفر صادقؑ سے قبل کسی مدرّس نے اس کو اپنا موضوعِ درس نہیں بنایا اور یہ جو آج ہم شیعہ مدارس اور دیگر اسلامی فرقوں میں اس کا زور دیکھ رہے ہیں یہ اسی ابتکار کا نتیجہ ہے جسے امام جعفر صادقؑ نے صدیوں پہلے عملی جامہ پہنایا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کے فلسفی مباحث، افلاطون اور ارسطو کے نظریات ہوا کرتے تھے

اور چونکہ آپؑ نے تدریسِ فلسفہ کی بنیاد ڈالی اس لئے بعد کے ادوار میں شیعہ مدارس نے اس علم کو اپنے طرزِ تعلیم میں شامل کر لیا۔

اسلام کے دوسرے فرقوں میں فلسفہ کی تعلیم شاذ و نادر ہی مشاہدہ میں آتی ہے۔ اور یہی وہ موضوع ہے جو یہ بتاتا ہے کہ فلسفہ کی وابستگی شیعی مکتبِ فکر کے ساتھ رہی ہے اور علاوہ شیعہ مکتبِ فکر کے، اب بھی بعض اسلامی فرقوں میں اس موضوع کو بے کار، ناقابلِ توجہ اور مذہب کے اعتبار سے بے اثر سمجھا جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ امام جعفر صادقؑ نے عرفان کو بھی اپنا موضوعِ درس بنایا۔ آپؑ کا عرفان مکتبِ اسکندریہ اور مشرق کے عرفان سے وابستہ تھا۔ آپؑ نے ان دونوں کی مدد سے ایک نیا عرفانی مکتب قائم کیا جس کو آپؑ کے ماننے والوں نے جعفری عرفان کا نام دیا۔ جعفری عرفان کا مشرق اور اسکندریہ کے عرفان سے تقابل یہ واضح کرتا ہے کہ جعفری عرفان نے تزکیۂ نفس اور اخلاقی امور کی طرح دنیاوی امور کو بھی قابلِ توجہ قرار دیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے خاص طور پر اخروی امور پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ آپؑ نے دنیوی امور، اخلاق اور تزکیۂ نفس پر زیادہ زور دیا۔ گویا آپؑ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جو ان امور میں کوشاں رہا آخرت میں اچھی جزا کا حق دار ہے اور یہ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے جو کچھ اس میں بویا جائے گا آخرت میں وہی کاٹا جائے گا۔ وہ لوگ جو اس دنیا میں اپنی دنیوی اور اخروی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں انہیں دوسری دنیا میں اپنے انجام سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے اور یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ انہوں نے آخرت کے لئے کوئی توشہ فراہم نہیں کیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا عرفان دوسرے مکاتبِ فکر میں پائی جانے والی مبالغہ آرائیوں سے یکسر پاک ہے۔ جس میں خالق و مخلوق کی وحدت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

آپؑ کے عرفان میں انسان اگر نیکوکار ہو گا تو موت کے بعد خدا سے قریب ضرور ہو گا مگر اس سے ملحق نہیں ہو گا۔ کیونکہ مخلوق خالق سے ملحق نہیں ہو سکتی اور جو فاصلہ

مخلوق کو خالق سے جدا کرتا ہے وہ کم ہو سکتا ہے لیکن ختم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ ہر طرح کی بحث کی پابندیوں سے آزاد تھی۔ اس میں شاگرد کو کھلی آزادی تھی کہ وہ اپنے استاد پر نکتہ چینی کرے اور اگر ہو سکے تو اس کے نظریہ کی تردید بھی کرے۔ امام جعفر صادقؑ اپنے نظریہ کو اپنے شاگردوں پر مسلط نہیں کرتے تھے بلکہ وہ انہیں آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ اگر ان کا دل چاہے تو وہ اسے قبول کریں وگرنہ رد کرنے میں کوئی روک ٹوک یا قباحت نہ تھی۔

آپؑ کے نظریہ کی تصدیق اور قبولیت کا ایک سبب آپؑ کے درس کی تاثیر تھی۔ جو لوگ آپؑ کی درس گاہ میں شرف یاب ہوئے تھے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؑ سے وابستہ ہو کر انہیں کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک عرصے تک اگر کوئی مدینے سے باہر اپنے آپ کو امام جعفر صادقؑ کا گرویدہ ظاہر کرتا تھا تو بس اس کی جان خطرے میں ہوتی تھی کیونکہ امّوی حکام انہیں دشمن کی نگاہ سے دیکھتے تھے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان میں مخالفت کی طاقت نہیں ہے۔ مگر چونکہ وہ انہیں دشمن گردانتے تھے اس لئے انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ فرصت ملتے ہی وہ اپنی دشمنی کا اظہار کریں گے۔

آپؑ کے شاگردوں کو ان باتوں کا علم تھا کہ ان کے لئے ترقی کی راہیں مسدود ہیں کیونکہ امام جعفر صادقؑ امّوی حکام کی طرح کسی دنیاوی منصب کے حامل نہیں تھے جس کے ذریعے وہ اپنے شاگردوں اور چاہنے والوں کو کوئی مقام عطا کرسکیں۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ کے پاس اتنی دولت بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی جیبِ خاص سے ان کی مدد کر سکیں۔ اس کے باوجود جو چیز انہیں آپؑ کی درس گاہ کی طرف کھینچ لاتی تھی وہ آپؑ کی قوتِ کلام اور اس کلام پر آپؑ کا ایمان تھا اور کیونکہ امام جعفر صادقؑ کو اپنی بات پر بھروسہ اور یقین تھا اس لئے آپؑ کی بات آپؑ کے شاگردوں پر مؤثر واقع ہوتی تھی۔

آپؑ اپنی طرزِ حیات میں اس ڈگر پر نہیں چلتے تھے جسے سولھویں صدی عیسوی کے

بعد سے ''یوتوپیا'' کا نام دیا گیا۔ (۱)

امام جعفر صادقؑ اپنے شاگردوں کو کسی ایسے آئیڈیل نظام سے روشناس نہیں فرماتے تھے جو تصوّراتی حد تک محدود ہو اور اسے عملی صورت نہ دی جا سکے۔

آپؑ کے پدرِ گرامی امام محمد باقرؑ کے زمانے میں جو شاگرد ان کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے یہ توقع رکھتے تھے کہ انہیں دنیوی مقام حاصل ہو اور وہ قاضی کے عہدوں پر فائز ہوں۔ کیونکہ امّوی خلیفہ ولید بن عبدالمالک نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ امام محمد باقرؑ کی درس گاہ سے فارغ التحصیل افراد میں سے کچھ کو منصبِ قضاوت کے لئے انتخاب کرے گا۔

لیکن امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں تعلیم پانے والے افراد کے لئے ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اور وہ صرف کسبِ معرفت کے لئے علم حاصل کر رہے تھے۔

مصر پر عربوں کے حملے اور اسکندریہ کی تباہی سے پہلے مکتبِ اسکندریہ اور امام جعفر صادقؑ کا مکتب دونوں بحث و مباحثہ کی آزادی کے قائل تھے لیکن ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ مکتبِ اسکندریہ مذہبی بحث و مباحثہ کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن امام جعفر صادقؑ کے درس میں مذہب پر بھی گفتگو ہوتی تھی اور شاگردوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ استاد کے نظریہ پر اعتراض کریں۔

بحث و مباحثہ کی اسی آزادی نے شیعی مکتبِ فکر کو فروغ دیا کیونکہ اس میں جبراً کوئی

ا۔ یوتوپیا دو یونانی جملوں (یو) یعنی نہیں یا (لا) اور ''توپیا'' یعنی مکان کا مرکب ہے اور اصطلاحاً یہ ایک تصوّراتی ملک کا نام ہے جو ایک آئیڈیل (لیکن غیر عملی اور تصوّراتی) نظام کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ یوتوپی ایک کتاب کا نام بھی ہے۔ جسے انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کے صدرِ اعظم ''تھامس قدر'' نے پندرھویں صدی عیسوی کے نیمۂ دوم میں لکھا جس میں سوسائٹی پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ''تمام افراد معاشی یا مادی بضاعت کے اعتبار سے برابر ہیں۔'' ''تھامس مور'' نے ۱۵۳۵ء میں سزائے موت پائی اور جس وقت اس کا سر تن سے جدا کیا گیا اس وقت اس کی عمر ۹۵ سال تھی۔ (فارسی مترجم)

وادب کو اتنی اہمیت حاصل نہیں۔ آپؑ کی مذہبی ثقافت میں علم و ادب کی اتنی اہمیت تھی کہ محقق کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ اس مذہبی ثقافت میں ادب اور علم کی زیادہ اہمیت تھی یا مذہب کی؟

آپؑ جانتے تھے اور آپؑ نے یہ ارشاد بھی فرمایا کہ مومن کو مستحکم ایمان کا حامل بننے کے لئے علم و ادب سے کام لینا چاہیے۔

آپؑ نے فرمایا ہے کہ ایک عام انسان کا ایمان بالکل سطحی اور غیر مستحکم ہے۔ ایک عام فرد ہونے کی حیثیت سے وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیوں اور کس پر ایمان رکھتا ہے؟ اور چونکہ اس کے ایمان میں استحکام نہیں لہٰذا وہ کسی بھی وقت اسے کھو سکتا ہے لیکن وہ مومن جو علم و ادب کا حامل ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیوں اور کس پر ایمان رکھتا ہے اور اسی لئے مرتے دم تک اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا۔ امام جعفر صادقؑ نے یہ بتانے کے لئے کہ علم و ادب کس طرح ایمان کو استحکام بخشتے ہیں دوسرے مذاہب کی مثال پیش کی اور فرمایا کہ جب اسلام وسعت پا کر جزیرۃ العرب سے دوسرے ملکوں میں داخل ہوا تو وہاں کے عام لوگوں نے فوراً ہی اسے قبول کرلیا جب کہ علم و ادب کے حامل افراد نے تامل سے کام لیا اور جب ان پر یہ ثابت ہوا کہ اسلام' دینِ دنیا و آخرت ہے تب وہ اس پر ایمان لائے اور انہوں نے اسے قبول کیا۔

امام جعفر صادقؑ نے ادب کی وہ تعریف کی ہے کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے زیادہ جامع تعریف کبھی کسی دانشمند کے ذہن میں ابھری ہو۔ آپؑ نے فرمایا کہ "ادب ایک پوشاک کا نام ہے جسے بولنے والے اور لکھنے والے اپنی تقریروں اور تحریروں کے زیب تن کرتے ہیں تاکہ وہ پڑھنے والے کے ذہن اور سننے والے کی سماعت پر زیادہ خوبصورت اور زیادہ دلکش انداز سے رونما ہو۔"

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ بولا یا لکھا جاتا ہے وہ اس پوشاک کے بغیر بدصورت و بدنما ہے۔ آپؑ اس پوشاک کے بغیر بھی تقریر و تحریر کو خوشنما اور دلنشین جانتے ہیں۔ تاہم آپؑ کا کہنا یہ ہے کہ جب انہیں ادب کی

پوشاک پہنائی جاتی ہے تو وہ کہیں زیادہ دلکش اور توجہ کا باعث بنتے ہیں۔ کیا امام جعفر صادقؑ کی رحلت کے بعد سے آج تک اس ساڑھے بارہ سو سال میں کسی نے ادب کی اتنی مختصر' اتنی جامع اور منطقی تعریف کی ہے؟

ادب کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا دوسرا نظریہ آپؑ کا یہ ارشاد ہے!

"ممکن ہے ادب کوئی علم نہ ہو تاہم کوئی علم ادب سے خالی نہیں" اور یہ بھی علم اور ادب کے ارتباط سے متعلق ایک نہایت مختصر اور جامع تعریف ہے۔

ہم یہ اندازہ نہیں کرسکتے کہ امام جعفر صادقؑ کو ادب سے زیادہ دلچسپی تھی یا علم سے؟ آپؑ کے ذہن میں شعر کی زیادہ اہمیت تھی یا علم طبیعیات کی؟ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جنہیں علم اور ادب دونوں سے یکساں دلچسپی رہی ہو۔ کیونکہ قریب قریب تمام نوع بشر کی فکری استعداد کچھ اس انداز کی ہے کہ وہ یا ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں یا علم سے۔

ادب سے شغف رکھنے والے علم کو ایک خشک اور خشن موضوع اور مادی فوائد و آسائش حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس میں زندگی کا مقصد سوائے دوسروں کو دبانے اور نقصان پہنچانے کے اور کچھ نہیں ہوتا اور اپنے آپ کو علم کی طرف جانے والوں سے زیادہ باذوق اور باسلیقہ تصور کرتے ہیں۔

علمی استعداد کے حامل افراد ادب کو طفلانہ سرگرمیوں یا تصوّراتی مشاغل میں شمار کرتے ہیں اور ایک مستعد انسان کو اس سے بالاتر سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ادب سے وابستہ کرے۔

سوداگروں اور تجارت پیشہ گروہ کے نزدیک ادب وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ گروہ ان لوگوں کی عقلِ سلیم پر بھی شبہ کرتا ہے جو ادب کو اہمیت دے کر اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس میں صرف کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عقلِ سلیم کے حامل افراد کبھی اپنی عمر کو ان امور میں ضائع نہیں کرتے جن سے انہیں کوئی مادی فائدہ حاصل نہ ہو۔ ہمیں اس گروہ سے کوئی مطلب نہیں کیونکہ اس گروہ کی نظر میں نہ صرف یہ کہ

ادب کی کوئی قدر وقیمت نہیں بلکہ اس وقت تک علم کی بھی کوئی وقعت نہ تھی جب تک اس نے صنعت کو وجود نہیں بخشا۔ لیکن جب علم نے صنعت کو فروغ دیا تو چونکہ صنعت' دولت و ثروت کی آماجگاہ تھی لہٰذا قابلِ قدر سمجھی گئی۔ اور علم کی اس قدر وقیمت کا آغاز بھی اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوا جب تاجروں نے ایسی صنعتوں کی طرف توجہ دی جن کے ذریعہ زیادہ منفعت حاصل کی جاسکتی تھی۔

امام جعفر صادقؑ ان شاذ و نادر اشخاص میں تھے جنہیں علم و ادب دونوں سے شغف تھا۔ آپؑ جس مقام پر درس دینے کے لئے بیٹھتے تھے وہاں آپؑ کے بالائے سر یہ شعر لکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

لیس الیتیم قد مات والده
ان الیتیم یتیم العلم والادب

یعنی "یتیم وہ نہیں جس کا باپ مرگیا ہو بلکہ یتیم وہ ہے جو علم وادب سے بے بہرہ ہو۔"

امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کے وجود میں آنے سے قبل' عربوں میں ادب کا اطلاق شعر پر ہوتا تھا۔ اور ہم کہہ چکے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں عربوں کے پاس نثری ادب کا فقدان تھا۔ اور پہلی صدی ہجری میں عربوں کے پاس نثر میں ادبی آثار بہت ہی کم تھے۔ جس میں نمایاں ترین یادگار حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی "نہج البلاغہ" ہے۔

امام جعفر صادقؑ دوسری صدی ہجری کے نیمہ اوّل میں نثری ادب کی جانب مائل ہوئے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ عربی زبان کا نثری ادب سے رشتہ استوار کرنے والی ہستی آپؑ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے عربوں میں ادبی انعامات کو برقرار کیا۔

اگر ادبی انعامات سے مراد یہ ہو کہ شاعر یا لکھنے والے کو کوئی صلہ ملے تو یہ روایت

درست نہیں کیونکہ شعراء کے لئے انعام کا طریقہ کار قدیم زمانے سے جزیرۃ العرب میں رائج تھا اور ظہورِ اسلام کے بعد بھی یہ رسم جاری رہی۔ جب کوئی شاعر اپنے خوبصورت شعر کو کسی رئیس کی خدمت میں پیش کرتا تو اسے انعام ملتا تھا۔

لیکن نثری ادب میں اس رسم کی ابتداء امام جعفر صادقؑ نے کی۔ عرب قوم' ظہورِ اسلام سے قبل اور اس کے بعد پہلی صدی ہجری میں نثری ادب کو ادبی آثار میں شمار ہی نہیں کرتی تھی چہ جائے کہ ان کے لکھنے والوں کو انعام و اکرام سے نوازے۔ نثری آثار پر انعام کی رسم ایک روایت کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے ایجاد کی۔

ہمیں اس بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے نثر کے ادبی آثار لکھنے والوں کے لئے انعامات کا انتظام کیا لیکن اس بات میں شبہ ہے کہ کیا آپ ہی وہ فردِ اوّل ہیں جنہوں نے ادیبوں کو انعام و اکرام سے نوازا' یا آپؑ سے پہلے آپؑ کے پدرِ بزرگوار امام محمد باقرؑ نے اس رسم کو جاری کیا۔

ابتداء میں امام جعفر صادقؑ اور ان کے دو شاگرد ادبی انعام کے مستحق افراد کا انتخاب کرتے تھے۔ لیکن بعد میں ان کی تعداد پانچ ہوگئی۔ اور جب ان میں سے تین افراد کسی لکھنے والے کے بارے میں متفق الرائے ہوتے تو اسے انعام کا حقدار قرار دیا جاتا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کا نثری ادب کے پھیلاؤ میں ایک کردار یہ بھی تھا کہ آپؑ لکھنے والوں کو مجبور نہیں کرتے تھے کہ وہ کسی خاص موضوع پر قلم فرسائی کریں۔ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق مضمون انتخاب کرنے میں آزاد تھا۔ مضمون کی تکمیل کے بعد وہ اسے امامؑ کی خدمت میں پیش کرتا اور آپؑ اسے پانچ افراد پر مشتمل کمیٹی کے سپرد کردیتے۔ اب اگر ان میں سے تین افراد اس لکھنے والے کو انعام کا حقدار قرار دیتے تو اسے انعام دیا جاتا۔ امام جعفر صادقؑ نے فراخدلی کے ساتھ نظم و نثر دونوں کو ادب میں شامل کیا۔ آپؑ کی نظر میں فقط شعر کہنے والا یا فی البدیہہ تقریر کرنے والا یا لکھ کر اسے پڑھنے والا ہی ادیب نہ تھا بلکہ جو کوئی جس موضوع پر نظم یا نثر میں زیادہ دلکش اندازِ تحریر اختیار کرتا وہ ادیب

کہلاتا۔ آپؑ علم اور ادب کو نہ صرف مذہبی ثقافت کے اعتبار سے ضروری جانتے تھے بلکہ ارتقاءِ بشراور مستحسن صفات کی تقویت کے لئے بھی اسے ضروری سمجھتے تھے۔

آپؑ جانتے تھے کہ جس قوم میں ادباء اور علماء کی فراوانی ہوگی وہاں مشکل ہی سے کسی کا حق سلب ہوگا اور اگر پوری قوم علم و ادب سے بہرہ ور ہو تو زندگی کے تمام شعبوں میں آسانیاں دکھائی دیں گی۔

امام جعفر صادقؑ نے مذہب، ادب، علم اور عرفان پر مبنی اس چار رکنی مذہبی ثقافت کو شیعہ مذہب کی تقویت و بقاء کے لئے اس سے کہیں زیادہ مفید اور ضروری جانا کہ کوئی اس کے لئے کسی عظیم الشان عمارت کی بنیاد قائم کرے۔

آپؑ نے شیعہ مذہب کے لئے "سن پیرے" کی طرح کسی عمارت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ اس مذہبی ثقافت کو تشکیل دیا جسے "سن پیرے" سے کہیں زیادہ دوام حاصل ہے۔ "سن پیرے" کے پہلے گرجا گھر کی طرح ایک مذہبی عمارت تباہ ہوسکتی ہے مگر امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ (ا) "سن پیرے" کے پہلے گرجا گھر کی تعمیر

ا۔ فرانسیسی "سن پیرے" "اٹالین" "سینٹ پیٹر" اور لاطینی "سانگتہ پیٹرس" دراصل ایک ہی لفظ ہے جس سے مراد روم کا وہ مشہور و معروف گرجاگھر ہے جو اپنے رقبے اور خوبصورتی کے اعتبار سے دنیائے مسیحیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس عجوبہء روزگار کو دیکھنے ہر سال ایک کروڑ پچاس لاکھ عیسائی دنیا کے مختلف علاقوں سے روم جاتے ہیں اور آج چار سو سال سے ۵۰ ماہرینِ تعمیر پر مشتمل اٹلی کی ایک جماعت تقریباً ایک سو کاریگروں کے ساتھ مستقل طور پر اس کی تعمیر میں مصروف ہے۔ پچاس ماہرینِ تعمیر کی یہ جماعت جسے اٹلی کی زبان میں "سام پیٹری" کہا جاتا ہے۔ لوگوں کے درمیان بہت قابلِ احترام ہے۔ یہ گرجاگھر اٹلی کے جدید ترین فنِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس عمارت کے اصل حصوں کی تعمیر ۱۲۰ سال میں مکمل ہوئی اور اس کی آرائش کا کام بیسویں صدی تک جاری رہا۔ اگر کیتھولک پادریوں کی مستقل انجمن نہ ہوتی تو آج بھی یہ گرجاگھر نہ ہوتا۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکہ اور روس دونوں نے اس چرچ کے احترام میں روم پر بمباری سے صَرفِ نظر کیا۔ (فارسی مترجم)

روم کے پہلے مسیحی بادشاہ "قسطنطین" کی طرف سے ۳۲۶ عیسوی میں شروع ہوئی اور کئی سال بعد اختتام کو پہنچی۔ یہ عبادت گاہ دورِ جدید کے آغاز تک قائم رہی اور کیتھولک مذہب کے پیشوا پوپ "جوئیل دوم" کے حکم سے ڈھا دی گئی اور اس کی جگہ موجودہ "سن پیرے" کا گرجا تعمیر ہوا (ا)۔

اگر امام جعفر صادقؑ بھی شیعہ مذہب کے لئے اسی طرح کی کوئی عظیم الشان عمارت تعمیر کرتے تو ممکن تھا کہ کوئی شخص اس مذہب سے مخالفت کی بناء پر اسے مسمار کردیتا اور آج اس کا نشان بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن آپؑ نے شیعی ثقافت کی تشکیل اور اس کے استحکام پر توجہ دی تاکہ یہ ہمیشہ باقی رہے۔ آپؑ نے اس مقصد کے لئے اس کے مذکورہ بالا چار ارکان کو تقویت دی خاص طور پر علم، ادب اور مذہب کے ارکان کو استحکام بخشنے کی کوشش کی اور اس حد تک محنت کی کہ دوسری صدی ہجری کا پہلا نصف حصہ جو آپؑ کی تدریس کا دور تھا، اسلامی دنیا میں علم و ادب کی ترقی کے آغاز کا دور کہلایا اگرچہ آپؑ اکیلے علم و ادب کے محرک نہ تھے تاہم آپؑ نے تن وتنہا اس میدان میں قدم آگے بڑھایا اور دوسروں نے آپؑ کی تاسّی کی۔

اگر امام جعفر صادقؑ علم و ادب کی توسیع اور علماء و ادباء کی تشویق کے لئے آگے نہ بڑھتے تو دوسری صدی ہجری کے نیمہء دوم اور پوری تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں عرب ممالک میں رونما ہونے والی عظیم ادبی اور علمی تحریک کا نام ونشان بھی نہ ہوتا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ علم وادب کی ترویج وترقی کے بانی عباسی خلفاء ہیں وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔

ا۔ دورِ جدید سے مراد وہ دور ہے جس میں یورپ نے علم وہنر اور پھر صنعت سے اپنا ناطہ جوڑا۔ مورخین نے اس کا آغاز ۱۴۵۳ میں سقوط قسطنطنیہ سے کیا ہے لیکن امریکہ کی دریافت کے بعد سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے علم وہنر اور پھر صنعت نے یورپ میں پھیلنا شروع کیا۔ (فارسی مترجم)

آغاز میں آنے والے عباسی خلفاء کا اپنی حکومت کے استحکام کے علاوہ اور کوئی منشاء نہ تھا۔ ان کے بعد آنے والوں کو زیادہ تر مادی لذتوں سے بہرہ مندی کی فکر تھی۔ انہوں نے علم و ادب کے سلسلہ میں جو توجہ دی گویا ان کی زندگی کے حاشیہ کی تشکیل تھی (جیسا کہ ہم بطور اختصار متوکل کے بارے میں عرض کر چکے ہیں)

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں علم و ادب کی طرف عباسی خلفاء کی توجہ محض رسم و رواج کی بنا پر تھی نہ یہ کہ انہیں علم وادب سے کوئی خاص لگاؤ تھا۔

پانچ سو سال مشرق میں حکومت کرنے والے ۳۷ عباسی خلفاء میں سے فقط گنتی کے چند ہی ایسے تھے جنہیں علم و ادب سے دلچسپی تھی ورنہ باقی سب کے سب مادی لذائذ کے حصول سے دلچسپی رکھتے تھے۔

مگر ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس بات سے بھی انکار نہیں کرنا چاہئے کہ انہیں معدودے چند لوگوں کی علم و ادب سے دلچسپی نے اس کی ترویج و ترقی میں ایک موثر کردار ادا کیا اگرچہ یہ دلچسپی ایک رسم کے طور پر ہی کیوں نہ وجود پذیر ہوئی ہو۔

ان کے ہاتھوں میں بیت المال کا اختیار تھا اور اس کے علاوہ وہ ان گراں قدر ہدایات سے بھی کام لیتے تھے جو انہیں وقتاً فوقتاً ملا کرتی تھیں۔ شعراء خطباء اور مبلغین کے لئے برابر انعامات اس کا سبب بنتے تھے کہ دوسرے بھی اس کی ہوس کریں اور جہاں تک ہوسکے اکتسابِ علم وادب میں کوشاں رہیں تاکہ ان پر بھی خلیفہ کی نظرِ عنایت ہو اور انہیں بھی برابر انعامات سے نوازا جائے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کے بدوی قبائل کے رؤسا کے یہاں شعر سننا ایک عام بات تھی۔ اور یہ وہاں کا ایک روایتی طرزِ عمل تھا جسے انہوں نے دوسری قوموں سے اخذ نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود اس کے موجد و بانی تھے۔

بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ کسی قبیلے کے سردار کو شعر سننے سے دلچسپی نہ ہو یا وہ اس کے مفہوم کو درک نہ کرتا ہو لیکن شعر کے مفہوم کو درک نہ کرنے والے بھی ایک سنت یا روایت کے تحت شاعر کے کلام کو سنتے تھے۔

"شوپنہاور" کا کہنا ہے کہ چونکہ بدوی قبائل کے رؤسا کو بیکاری کے سبب تھکاوٹ ہوتی تھی لہٰذا وہ اپنا وقت شاعروں کا کلام سننے میں صرف کرتے تھے۔

"شوپنہاور" بدوی عربوں کے رؤسا کی شعر سے دلچسپی ہی کو ان کی بے کاری کا سبب نہیں جانتا بلکہ اس کی نظر میں تحصیلِ معاش کے علاوہ باقی تمام امور بے کاری میں شمار ہوتے ہیں۔۔۔ کھیل ہو، تفریح ہو یا دعوتیں اور شب نشینیاں، وہ ان سب کو بے کاری کا ایک مشغلہ جانتا ہے۔

اس جرمن فلسفی نے اپنے کام کے کمرے میں بالائے سر اس مضمون کا کتبہ نصب کیا تھا کہ "وہ شخص جو تمہیں دوپہر یا رات کے کھانے پر مدعو کرتا ہے تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ وہ تمہیں کام سے روکتا ہے۔" یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بے کاری کی وجہ سے حکمت و فلسفہ سے وابستہ ہوگیا تھا کیونکہ فلسفہ شوپنہاور کے لئے کسبِ معاش کا وسیلہ تھا اس لئے کہ وہ اس کا درس دیتا تھا۔

شاعر جب سردارِ قبیلہ کے سامنے اپنے اشعار پڑھتا تھا تو اسے انعام ملتا تھا اور رسم

۱۔ مشہور جرمن فلاسفر شوپنہاور نے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۸۶۰ء میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔ تاریخ حکمت میں اسے ایک بدبین فلسفی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ وہ دکھ درد کو انسان کی سرنوشت کا حصہ سمجھتا تھا اور کہتا تھا چونکہ انسان اپنی خواہشات کو جامۂ عمل نہیں پہنا سکتا لہٰذا اسے تکلیف ہوتی ہے اور یہ روحانی اذیت آخری سانس تک اس کے ساتھ رہتی ہے۔ "دنیا فکر و خواہش" اس کی مشہور ترین کتاب ہے۔ شوپنہاور کی نظر میں کوئی شے قابل قدر نہیں ہے مگر اخلاق۔ چونکہ اس کے بقول احساس ہمدردی کا نام ہے جو دوسروں کی تکلیف کے مشاہدہ سے انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس کے نزدیک صحیح طور پر علم وادب کی بھی وقعت نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان اپنے ضعیف احساسات اور مستقل بے کاری سے تنگ آجاتا ہے تو علم وادب سے وابستہ ہو جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اپنے آپ کو مصروف رکھے اور یہ کہ فضل فروشی اور تفاخر سے کام لے کر اپنے حقارت کے احساس میں کمی پیدا کرے۔ (فارسی مترجم)

ادب یہ تھی کہ وہ اپنے کلام میں چند اشعار رئیسِ قبیلہ کی مدح و ثنا کے لئے بھی وقف رکھے۔ البتہ اس کی تعریف ایک معین حد سے آگے نہیں بڑھتی تھی اور دورِ جاہلیت کے شاعر مدح سرائی میں غلو سے کام نہیں لیتے تھے اور اپنے آپ کو قبیلے کے سردار کے سامنے حقیر وذلیل ظاہر نہیں کرتے تھے ان کی مدح اس تشکر کی مانند تھی جو مہمان نوازی کے بعد ایک مہمان میزبان سے کیا کرتا ہے۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ "عکاظ"(عکاظ۔ ایک میلہ جو اسلام سے پہلے مکہ میں ہوتا تھا اور تین ہفتے جاری رہتا تھا۔) کی منڈی میں اشعار سنانے والے شعراء لوگوں سے رقم وصول کرتے تھے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

عرب کا شاعر دورِ جاہلیت میں اپنی قدروقیمت کا قائل تھا اور اپنی شخصیت کو محترم جانتا تھا اور قبائلی رؤسا سے جو صلہ وصول کرتا تھا وہ ایک قسم کی اجرت اور حقِ زحمت ہوتا تھا۔ شعر پڑھنے کے باعث جتنا حق اس کا رئیسِ قبیلہ پر ہوتا تھا اتنا حق اس کا نہیں ہوسکتا تھا جو صلہ دیتا تھا۔ شاعر یہ کہہ سکتا تھا کہ اس نے شعر کہہ کر قبیلہ کے سردار پر احسان کیا ہے مگر قبیلہ کا سردار یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے صلہ دے کر شاعر پر احسان کیا ہے۔

"عکاظ" کے موقع پر شعر پڑھنے والوں کا مقصد تفاخر تھا لوگوں سے کچھ بٹورنا نہ تھا۔ البتہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ جزیرۃ العرب میں کسی نے قبیلے کے سرداروں کے لئے یا پھر "عکاظ" کے موقع پر کوئی نثری کلام پیش کیا ہو۔ جو کلمات و مضامین شعر کے قالب میں نہ ڈھالے جاتے عرب میں ادب کا حصہ شمار نہ کئے جاتے تھے۔

یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا اور قرآن یہی وجہ ہے کہ نثرِ عرب کا پہلا نثری ادب ثابت ہوا لیکن عربوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ قرآن کو ایک ادبی یادگار سمجھیں انہوں نے اسے معجزہ جانا یعنی ایک ایسی شے جو ماوراء ادب اور اس سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔ باوجود یہ کہ قرآن نے عرب قوم کو یہ بتایا کہ ایک نثری ادب کو وجود میں لایا جاسکتا

ہے مگر پہلی صدی ہجری میں سوائے حضرت علی ابن ابی طالبؑ آپؑ کے پوتے امام زین العابدینؑ اور پھر امام محمد باقرؑ کے علاوہ پورے جزیرۃ العرب میں کسی نے یہ کوشش نہ کی کہ وہ کتاب لکھے اور ادبی نثر کی تخلیق کرے۔ امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک وہ لوگ جو کوئی کتاب لکھنا چاہتے انہیں یہ فکر لاحق ہوتی کہ اپنے افکار کو شعر کے قالب میں سموئیں اور چونکہ شعر بحروں کے اوزان کا پابند ہوتا ہے اور شاعر کو قافیہ کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے لہٰذا وہ آزادی کے ساتھ صحیح طور پر اپنے افکار کو آنے والی نسلوں کے لئے قلمبند نہیں کرسکتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ نے نثری ادب کی توسیع کے ذریعہ شعر کے قالب میں محبوس اسلامی مفکرین کے افکار کو بال وپَر دیئے اور اس وقت میں جس کسی نے کوئی کتاب لکھنی چاہی اس نے نثر سے استفادہ کیا مگر اس طرح کہ اسلامی ادب میں شعر کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہم یہ بتاچکے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے بالائے سر جو کتبہ تھا اس پر یہ عبارت درج تھی کہ۔

ليس اليتيم قد مات والده

ان اليتيم يتيم العلم والادب

"یتیم وہ نہیں جس کا باپ مرگیا ہو بلکہ وہ ہے جو علم وادب سے بے بہرہ ہو۔"

---☆---☆---

علم امام جعفر صادقؑ کی نظر میں

امام جعفر صادقؑ اس امر کی طرف متوجہ تھے کہ علم و ادب نہ صرف یہ کہ شیعوں کی مذہبی ثقافت کو طاقتور بناتا ہے بلکہ دیگر اقوام کے مقابل مسلمانوں کی تقویت کا ذریعہ بھی ہے۔ چنانچہ علم و ادب نے دنیائے اسلام میں اس حد تک ترقی کی کہ چوتھی صدی ہجری علمی اور ادبی حیثیت سے سنہری صدی قرار پائی اور یورپ والوں نے بھی اسلامی علوم سے بہت فائدہ اٹھایا۔

امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ متعدد علوم میں کون سا علم دوسروں پر ترجیح رکھتا ہے تو آپؑ نے جواب دیا کہ کلّی حیثیت سے تو کوئی علم دیگر علوم پر ترجیح نہیں رکھتا لیکن استفادہ کے مواقع ایک دوسرے میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ آدمی بعض علوم سے جلد تر اور زیادہ تر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس دور کی انسانی زندگی میں دو علوم زیادہ فائدہ بخش ہیں ایک علمِ دین اور دوسرا علمِ طب۔

علمِ دین سے آپ کی مراد اس کی فقہ کا بیشتر حصہ تھا اور آپ بتانا چاہتے تھے کہ تمام علوم میں علمِ حقوق و فرائض اور علمِ طب آپ کے زمانہ میں مسلمانوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہیں۔ نیز آپؑ نے فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے کہ جب انسان ان علوم سے بھی استفادہ کرے گا جن سے آج عملی فائدہ اٹھا رہا ہے اور یہ محال ہے کہ

کوئی علم عملی فائدہ نہ رکھتا ہو خلاصہ یہ کہ سارے علوم سے بنی نوع انسان کا عملی استفادہ زمانے کے تقاضوں پر منحصر ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا عقیدہ تھا کہ نوع بشر نے اس دنیا کی اپنی طولانی زندگی میں بہت مختصر سے اوقات علم کے لئے وقف کئے ہیں اور زیادہ تر اس سے دور ہی رہا ہے۔ اسے دو چیزوں نے علم سے الگ رکھا ہے۔ اوّل مربّی اور معلّم کی غیر موجودگی جو اسے حصولِ علم کا شوق دلاتا اور دوسری انسان کی کاہلی اور یہ کہ علم حاصل کرنے میں چونکہ زحمت تھی لہٰذا وہ اس زحمت طلب کام سے بھاگتا رہا۔

اگر ہم مثال کے طور پر اس دنیا میں نوعِ انسان کی زندگی دس ہزار برس سمجھ لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ آدمی نے اس طولانی مدّت میں سے صرف سو سال حصولِ علم میں صرف کئے ہیں' اگر اس سے زیادہ وقت اس کام میں صرف کیا ہوتا تو آج بہت سے علوم کے عملی فوائد سے بہرہ مند ہوتا۔

یہاں اس نکتے کا ذکر بے محل نہ ہو گا کہ اس دور کے علماء نے عبرانی تقویم سے مطلب اخذ کرتے ہوئے اس دنیا کی عمر چار ہزار سات سو سال سے کچھ زائد قرار دی تھی۔ اور ان کی نظر میں نوع بشر کی تازہ عمر اس سے کم تھی کیوں کہ پہلے دنیا پیدا کی گئی اس کے بعد انسان وجود میں آیا۔

لیکن جب امام جعفر صادقؑ نے مثال دینا چاہی تو آپ نے دس ہزار سال کا حوالہ دیا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ دنیا اور نوع بشر کے آغاز کے بارے میں عبرانی تقویم سے متفق نہیں اگرچہ کسی مثال کو دلیل نہیں سمجھنا چاہئے لیکن اس سے مثال دینے والے کے طرزِ فکر کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے اگر آپ کا عقیدہ یہ ہوتا کہ نوع بشر کی عمر چار ہزار سات سو سال سے زیادہ ہے تو دس ہزار سال کا ذکر نہ کرتے بلکہ اس سے کمتر مثلاً تین ہزار سال کو شاہدِ مثال قرار دیتے۔

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائشِ زمین کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی معلومات اپنے ہم عصروں سے زیادہ تھیں کیوں کہ کبھی کبھی آپ سے ایسی باتیں

سننے میں آتی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ آغازِ خلقت کی نوعیت سے باخبر ہیں۔ ایک روز آپؑ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تم پہاڑوں کے اوپر جو بڑے بڑے پتھر دیکھتے ہو یہ ابتدا میں پگھلے ہوئے مادے تھے جو سرد ہونے کے بعد اس شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ساڑھے بارہ سو سال قبل پیش کئے جانے والے اس نظریئے کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے یہ بتانا کافی ہو گا کہ انقلابِ فرانس کے آغاز اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک یورپی دانشمند اس شک اور شبہ میں مبتلا تھے کہ آیا زمین ابتدا میں ایک پگھلا ہوا مادہ تھی یا نہیں؟ اور اس سے ایک صدی پہلے سارے یورپ میں کوئی ایسا دانشور موجود نہ تھا جو یہ کہہ سکے کہ شاید زمین اپنے آغاز میں ایک پگھلا ہوا مادہ تھی ان کا خیال تھا کہ زمین اسی شکل میں پیدا ہوئی جس میں آج ہم کو نظر آرہی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے حصولِ علم میں انسانوں کی کاہلی کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ ایک حقیقت ہے۔ آج انسان شناسی کے ماہرین کہتے ہیں کہ جب سے نسلِ انسانی دو پاؤں پر چلنے کے قابل ہوئی ہے اس کو پانچ لاکھ سال ہوئے ہیں۔ اس سے قبل اس سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ علوم کی جانب توجہ کر سکے کیوں کہ چار ہاتھ پاؤں پر چلنے کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انسان آلات اور اوزار بنا کے صنعت میں داخل ہو اور اس ذریعہ سے علوم تک پہنچے۔ البتہ پانچ یا چار لاکھ سال میں جب سے یہ دو پاؤں پر چلنے لگا اور اس کے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے تو یہ آلات اور اوزار بنانے پر قادر ہوا اور گزشتہ ایک لاکھ سال میں اس نے آگ سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بھی دریافت کر لیا۔ اگر ان ہی ایک لاکھ سال کے اندر اس نے علوم سے تعلق استوار کیا ہوتا تو آج زندگی کے سارے مسائل بلکہ شاید موت کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہوتا۔ لیکن ان ایک لاکھ برسوں میں علوم کی جانب انسانوں کی توجہ مجموعی طور پر پندرہ سو سال سے آگے نہیں بڑھی اور اس مختصر مدت میں بھی انسان کی یہ توجہ گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔

ایک چیز جو ہماری نظر میں ناقابلِ تردید معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ڈکارٹ جس کے

دور کو تین صدیاں گزر رہی ہیں وہ پہلا شخص ہے جس نے جدید علمی تحقیق کی ابتداء کی اور کہا کہ علمی حقیقت تک پہنچنے کے لئے جسم کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا چاہئے پھر ان کو اور بھی چھوٹے حصوں پر تقسیم کرنا چاہئے اور یہ سلسلہ قائم رکھنا چاہئے یہاں تک کہ سب سے چھوٹے جزو کو تقسیم نہ کیا جا سکے۔ اس کے بعد اس نے سب سے چھوٹے جسم پر تحقیق شروع کی۔ اس کے خواص کا پتہ لگایا اور دریافت کیا کہ طبیعیاتی اور کیمیائی لحاظ سے اس کی نوعیت کیا ہے اور اگر جسم کے سب سے چھوٹے جزو کے خواص معلوم کئے جا سکیں تو خود اس جسم کے خواص بھی دریافت کئے جا سکتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں علمی ارتقاء کا بہت بڑا حصہ ڈکارٹ کے اسی نظریئے کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر اس نے یہ نظریہ پیش نہ کیا ہوتا تو اس قدر علمی پیش رفت نہ ہوتی۔ یہ جان لینا چاہئے کہ جس چیز نے ڈکارٹ کے نظریہ کو مقبولیت بخشی وہ ساتویں صدی عیسوی کے بعد ٹیکنالوجی اور صنعتوں کی توسیع تھی۔ ڈکارٹ سے بائیس سو سال قبل یونان کے حکیم ذیم قراطیس نے کلی طور پر یہ نظریہ پیش کیا تھا۔

البتہ امام جعفر صادقؑ نے ذیم قراطیس کے نظریہ کی تشریح و توضیح کی اور فرمایا کہ اشیاء کے خواص ہم پر اسی وقت بخوبی ظاہر ہوتے ہیں جب ہم کسی چیز کے چھوٹے حصے پر باریک بینی کے ساتھ تحقیق کریں اور اس کے خواص سے بڑے جسم کے خواص کا پتہ لگائیں۔ ہمارے لئے دنیا کے سمندروں اور دریاؤں کے سارے پانی کے بارے میں تحقیق ممکن نہیں ہے لیکن اگر اسی پانی کے ایک قطرے پر تحقیق کریں تو ہمیں جو کچھ معلوم ہو گا اس سے پورے دریا کے خواص کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر صنعت اور ایجادات میں اتنی پیش رفت نہ ہوتی اور جسموں کو چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنے کے وسائل دانشوروں کی دسترس میں نہ آتے تو ذیم قراطیس اور امام جعفر صادقؑ کے اقوال کے مانند ڈکارٹ کا قول بھی تھیوری کی حدود سے آگے نہ بڑھتا۔

اگر آج ایک ملی میٹر کے دس لاکھویں حصے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے تو یہ صنعتی ترقی ہی کی وجہ سے ہے ذیم قراطیس کے زمانے میں جو چیز آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتی

تھی وہ ایٹم یا ناقابلِ تقسیم جزو تھا اور آج ایک ملی میٹر کا دس لاکھواں حصّہ بھی ناقابلِ تقسیم جزو نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے جو دیگر سوالات کئے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کسی کو عالمِ مطلق کہا جا سکتا ہے؟ اور انسان کس موقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے ہر چیز سیکھ لی ہے؟

آپ نے فرمایا کہ تمہیں اس سوال کو دو حصّوں میں الگ الگ کر کے مجھ سے پوچھنا چاہئے۔ پہلا حصّہ جس کے متعلق سوال کر سکتے ہو یہ ہے کہ کس شخص کو عالمِ مطلق کہا جا سکتا ہے؟ تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ ذاتِ خدا کے علاوہ کوئی عالمِ مطلق موجود نہیں ہے اور کسی بشر کا عالمِ مطلق ہونا محال ہے کیوں کہ علم اس قدر وسیع ہے کہ کوئی شخص تمام دریافت طلب باتوں کو معلوم نہیں کر سکتا، چاہے وہ ہزاروں سال زندہ رہے اور اس طولانی مدت میں مسلسل حصولِ علم میں مشغول رہے۔

ہو سکتا ہے وہ کئی ہزار سال کی عمر میں شاید اس دنیا کے جملہ علوم سے واقف ہو جائے لیکن اس دنیا کے علاوہ اور دنیائیں بھی ہیں اور ان میں بھی علوم موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کے سارے علوم سیکھ کے دوسری دنیاؤں میں پہنچے تو وہاں کے لئے جاہل ہو گا۔ اور اسے سرے سے علم حاصل کرنا ہو گا۔ تاکہ ان دنیاؤں کے علوم سے واقف ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ ذاتِ خدا کے علاوہ اور کوئی عالمِ مطلق نہیں ہے اس لئے کہ نوعِ بشر میں سے کوئی فرد بھی جملہ معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔

آپ کے شاگردوں نے سوال کا دوسرا حصّہ پیش کیا اور پوچھا کہ انسان کس موقع پر علم سے غنی ہو جاتا ہے؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب پہلے ہی جواب میں دیا جا چکا ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ اگر انسان ہزاروں سال کی عمر پائے اور برابر تحصیلِ علم میں مشغول رہے تب بھی سارے علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا اس بنا پر کبھی بھی کوئی وقت ایسا نہیں آسکتا جب ایک شخص یہ محسوس کر سکے کہ وہ علم سے غنی ہے۔ صرف وہی

لوگ خود کو علم سے غنی محسوس کرتے ہیں جو جاہل ہیں۔ کیوں کہ جو شخص جاہل ہوتا ہے وہی خود کو علم سے بے نیاز جانتا ہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کے علم سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے علاوہ اور بھی ایسی دنیائیں موجود ہیں جو اس دنیا سے کافی بڑی ہیں اور اُس دنیا میں ایسے علوم ہیں جو یہاں کے علوم سے مختلف ہیں۔ آپؑ سے پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کی تعداد کتنی ہے تو جواب میں فرمایا کہ سوائے خدا کے اور کوئی ان کی تعداد سے واقف نہیں۔ پھر پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کے علوم اس دنیا کے علوم سے کس طرح مختلف ہیں؟ کیا علم سیکھنے کی چیز نہیں ہے؟ اور جو چیز سیکھنے کے لائق ہو وہ اس دنیا کے علوم سے مختلف کیوں کر شمار کی جا سکتی ہے؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ دوسری دنیاؤں میں دو طرح کے علم پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو اس دنیا کے علوم سے مشابہ ہے اور اگر کوئی شخص یہاں سے وہاں جائے تو انہیں سیکھ سکتا ہے۔ لیکن بعض دنیاؤں میں ایسے علوم کی موجودگی کا امکان ہے جنھیں درک کرنے پر نوعِ انسانی کے دل و دماغ قادر نہیں ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کا یہ قول بعد میں پیدا ہونے والے دانشوروں کے لئے ایک معمہ بنا رہا۔ چنانچہ بعض اس کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ لائقِ توجہ نہیں ہے۔ انہیں تردید کرنے والوں میں ابنِ راوندی اصفہانی بھی ہے۔ جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ عقلِ انسانی ہر اس چیز کے ادراک پر قادر ہے جو علم ہو، چاہے اس دنیا کے علوم ہوں چاہے دوسری دنیاؤں کے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے اپنے استاد کے قول کو تسلیم کیا اور اس بات کے قائل ہوئے کہ بعض دنیاؤں میں ایسے علوم موجود ہیں جنھیں افرادِ بشر حاصل نہیں کر سکتے کیوں کہ ہماری عقلیں انہیں سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں البتہ اس صدی میں جب آئین اسٹائین کی نسبیت کی تھیوری نے فزکس میں ایک بالکل جدید باب کا اضافہ کیا پھر اس کے بعد وجودِ ضد مادہ کی تھیوری نے تھیوری

کی حدود سے آگے بڑھ کے علم کے مرحلے میں قدم رکھا اور دانشوروں پر ثابت ہوگیا کہ مادے کی ضد موجود ہے تو آپ کا قول سمجھ میں آگیا۔ کیوں کہ ضدِ مادہ کی دنیا کے طبیعیاتی قوانین ہماری دنیا کے طبیعیاتی قوانین سے مختلف ہیں اور اس سے بالاتر منطق و استدلال کے اصول و قواعد ان کے علاوہ ہیں جن کے وضع اور ادراک پر ہماری عقل قدرت رکھتی ہے۔ دنیائے ضدِ مادہ ایک ایسا عالم ہے جہاں ایٹموں کے اندر الیکٹرانوں کی قوت مثبت اور پروٹانوں کی قوت منفی ہے۔ لیکن ہماری دنیا میں الیکٹران کی قوت منفی اور پروٹان کی مثبت ہے۔

جس دنیا میں الیکٹران کی قوت مثبت اور پروٹان کی قوت منفی ہے، معلوم نہیں وہاں کن طبیعیاتی قوانین کی حکمرانی ہے۔ ہماری منطق اور استدلال میں کلّ جزٗ سے برتر ہے لیکن اس دنیا میں ممکن ہے کہ جزٗ کلّ سے برتر ہو اور ہمارا دماغ اس پر قادر نہیں ہے کہ اس موضوع کو سمجھے اور قبول کرے۔

ہماری دنیا میں جس وقت کسی وزنی جسم کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے تو وہ ارشمیدس (Archimedes) کے اخذ کئے ہوئے قانون کے مطابق ہلکا ہو جاتا ہے لیکن اس دنیا میں اگر کسی جسم کو پانی یا کسی اور سیال میں ڈبو دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وزنی ہو جائے۔ پاسکل (Blaise Pascal) کے قانون کے مطابق جب کسی ظرف کے اندر ایک سیال شے کے کسی ایک نقطے پر دباؤ پڑتا ہے تو وہ دباؤ اس سیال کے تمام نقطوں پر پہنچتا ہے چنانچہ اسی قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وسائلِ نقل و حمل اور بالخصوص وزنی وسائلِ نقل و حمل کے لئے تیل کے بریک بنائے جاتے ہیں اور بریک کے پیڈل پر ڈرائیور کے پاؤں کے دباؤ سے جو تھوڑا سا دباؤ تیل کے اوپر پڑتا ہے وہ چونکہ تیل کے سارے نقاط اور اجزاء تک پہنچتا ہے لہٰذا اس سے ہزار گنا زیادہ دباؤ چلتے ہوئے پہیوں پر پڑتا ہے۔ اور انہیں دم بھر میں ساکن کر دیتا ہے۔ لیکن فزکس کا یہ قانون ممکن ہے دنیائے ضدِ مادہ میں موثر نہ ہو اور جو دباؤ سیال شے کے ایک نقطے پر پڑتا ہے وہ اس کے دوسرے نقطوں پر اثر انداز نہ ہوتا ہو! اگر کوئی شخص اس دنیا سے دنیائے ضدِ مادہ میں

پہنچے تو ممکن ہے کہ وہاں کے فزکی (طبیعیاتی) قوانین کے ساتھ جو اس کے لئے خلاف عادت و معمول ہیں، بتدریج مانوس ہو جائے جیسا کہ خلانورد خلائی راکٹوں میں زمین کے گرد گردش کرتے ہیں، یا چاند کے کرّے پر قدم رکھتے ہیں تو بے وزنی سے مانوس ہو جاتے ہیں کیوں کہ انہیں فضاء میں بھیجنے سے پہلے زمین ہی پر بے وزنی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔

لیکن جن چیزوں کو آدمی دنیائے ضدِ مادہ میں قبول نہیں کر سکتا وہ ایسی چیزیں ہیں جو اس کے قوانینِ منطق و استدلال کے خلاف ہیں۔

اگر وہ اس دنیا میں جزٗ کو کلّ سے برتر پائے، اگر دیکھے کہ وہاں کے لوگ اعداد کے جمع و تفریق اور ضرب و تقسیم میں چار بنیادی عمل کے قواعد کا لحاظ نہیں رکھتے اور اگر محسوس کرے کہ وہاں حرارت پانی کو منجمد کر دیتی ہے اور برودت بھاپ بنا دیتی ہے بغیر اس کے کہ خلا کا کوئی وجود ہو تو وہ ان غیر عقلی مشاہدات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی سبب ہے کہ اس دور میں امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ کہ بعض دوسری دنیاؤں میں ایسے علوم بھی ہو سکتے ہیں جنھیں حاصل کرنے کی طاقت و صلاحیت انسان کے پاس نہیں ہے، قابلِ قبول نظر آتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے قول نے اس قدیم فلسفی بحث کو حیاتِ نو بخشی جو یونان میں علم کے بارے پیش کی گئی تھی۔ وہ بحث یہ ہے کہ آیا علم بذاتِ خود موجود ہے یا وہ ہے جو ہم استنباط کرتے ہیں یعنی طبیعی ہے؟

بعض یونانی دانشور کہتے ہیں کہ تنہا علم وجود نہیں رکھتا ہے۔ علم وہ چیز ہے جو ہم اشیاء اور حالات سے درک کرتے ہیں اور اس کے قواعد کے ذریعہ اس کا سراغ لگاتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ مادر زاد اندھا رنگوں کا علم حاصل نہیں کر سکتا اور مادر زاد بہرہ علمِ موسیقی کا ادراک کرنے پر قادر نہیں ہے۔

وہ کہتے تھے کہ صرف ایک یا دو ظاہری حواس کی کمی تمام علوم کے ادراک میں مانع نہیں ہے بلکہ حواسِ باطنی کی کمی بھی اس سے مانع ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک دیوانہ کسی قسم کا علم حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا چاہے اس کے ظاہری حواس میں کسی

طرح کا نقص نہ پایا جاتا ہے۔

اس گروہ کے مقابل یونانی دانشمندوں ہی کی ایک جماعت کہتی تھی کہ مجرد علم موجود ہے قطع نظر اس سے کہ انسان اس کا ادراک کرے یا نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جو علم دنیا میں چار فصلوں کو وجود میں لاتا ہے ۔ وہ موجود ہے چاہے انسان ان فصلوں کا ادراک کرے یا نہیں اور جو علم سورج اور چاند کو زمین کے گرد حرکت دیتا ہے وہ اپنا وجود رکھتا ہے۔ خواہ انسان کے پاس آنکھ ہو اور وہ آفتاب و ماہتاب کو دیکھ سکے یا مادر زاد اندھا ہو اور ان کا مشاہدہ نہ کر سکتا ہو۔

ذیم قراطیس جو یہ کہتا ہے کہ دنیا ایٹم سے وجود میں آئی ہے' اس کا عقیدہ تھا کہ دو طرح کے علوم موجود ہیں ایک وہ جنھیں معلوم کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ جن کے قواعد و جزئیات کا ادراک نہیں کیا جا سکتا ۔ ان مجہول علوم میں سے ایک ایٹموں کا علم ہے ۔ اور دوسرے خداؤں کے علوم ہیں۔

ذیم قراطیس کے سو سال بعد اس پر اعتراض کیا گیا کہ جب اس نے یہ بتایا کہ ایٹموں کا علم مجہول ہے اور انسان اس کے قواعد و جزئیات کو دریافت کرنے سے قاصر ہے تو اس نے یہ کیوں کر کہا کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے؟ کیوں کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ایٹم کے علم اور اس کے قواعد و جزئیات سے آگاہ ہو۔ خود ذیم قراطیس تو موجود نہ تھا جو اس کا جواب دیتا۔ البتہ اس کے عقیدت مندوں نے کہا کہ اس کی عقل کہتی تھی کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے لیکن اس کے حواس اس پر قادر نہ تھے کہ وہ ایٹموں کا مشاہدہ کر سکے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں آدمی اپنی عقل سے تو سمجھ سکتا ہے لیکن حواس کے ذریعے انہیں محسوس نہیں کر سکتا۔

ذیم قراطیس کے ماننے والے اپنے استاد کے مخالفین کو خاموش کرنے کا ایک موثر وسیلہ رکھتے تھے کہ خدا کو نہ حواسِ ظاہری سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ سنا ' اور نہ حواسِ باطنی کے ذریعے اس کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم حواسِ باطنی کے وسیلے سے اپنی بیماری کا پتہ لگا لیتے ہیں بغیر اس کے کہ اسے دیکھیں اور اس کی آواز سنیں۔

ذیم قراطیس بھی اپنی عقل کے ذریعے اس نکتے تک پہنچا کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے۔ اور اگر وہ ایٹم کے علم کے قواعد اور جزئیات کو دریافت نہیں کر سکا تو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

ہمارے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یونانی دانشوروں میں بھی ایسے لوگ تھے جن کا کہنا تھا کہ علوم دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کے ادراک پر بشری عقل قادر ہے۔ اور دوسرے وہ جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں اور وہ اپنے شعور و عقل کے ذریعے ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ۔

مندرجہ بالا بحث سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اوّل تو امام جعفر صادقؑ علم کو غیر محدود سمجھتے تھے اور دوسرے آپ کا عقیدہ تھا کہ کچھ علوم دوسری دنیاؤں میں ایسے ہیں جنہیں انسان عقل و شعور کے ذریعے درک نہیں کر سکتا جیسے اس دنیا میں تحصیلِ علم کرتا ہے۔ آج آئین اسٹائین کی نسبیت کی تھیوری اور نظریۂ ضدِ مادہ کے بعد جس کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ تھیوری کی حدود سے گزر کے علمی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ساڑھے بارہ سو سال قبل امام جعفر صادقؑ نے ایک صحیح نظریہ پیش کیا تھا۔

عباسی دور کا ایک مشہور و معروف مورخ جس نے امام جعفر صادقؑ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن ابی الحدید ہے جس کی موت عباسی خلافت کا دور ختم ہونے سے ایک سال قبل ۶۵۵ھ میں ستریا ساٹھ سال کے سن میں ہلاکو خان کے ہاتھوں ہوئی اور اس کا نام عزالدین عبدالحمید ابن محمد تھا یہ کہتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد تقریباً ڈیڑھ یا دو سو سال کی مدت تک عربستان بین النہرین ' عراق و عجم و خراسان اور ایران میں جو مدّرس درس دیتا تھا وہ امام جعفر صادقؑ سے سند لینے کی کوشش کرتا تھا کہ امام جعفر صادقؑ سے اس طرح منقول ہے۔ پھر یہی مورخ کہتا ہے کہ اہلسنّت والجماعت کے فرقوں کے مدّرسین بھی درس دیتے وقت آپ سے روایت نقل کرتے تھے۔

ایک روز بنی عباس کے آخری وزیر ابن علقمی نے ابن ابی الحدید سے پوچھا کہ گزشتہ دور میں عالمِ اسلام کا سب سے بلند پایہ عالم اور دانشمند کون تھا تو اس نے جواب دیا کہ امام جعفرِ صادقؑ۔

چونکہ امام جعفرصادقؑ کو سب سے بڑا اسلامی دانشور مانا گیا ہے لہٰذا ایک محقق چاہتا ہے کہ آپ کے معیارِ علم (میزانِ معلومات) سے واقفیت حاصل کرے۔

شیعہ مورّخین کی کتابوں میں امام جعفرصادقؑ کے علوم کا شمار ایک سو سے پانچ سو تک کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ شیعہ مورّخین کی ایک جماعت نے جس قدر آپ کے معجزات کے بارے میں لکھا ہے اس قدر آپ کے علوم کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔

شیعہ مورخین آپ کے اعجاز پر جو عقیدہ رکھتے تھے اس کی بنا پر ایران کے ایک گروہ کی کتابوں میں آپ کی سوانح کو آپ کے معجزات ہی کے ذیل میں لکھا گیا ہے اور ان کی بعض کتابوں میں تو آپ کے معجزات کی تفصیل سے کافی صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

شیعہ مورخین کی ایک جماعت کی کتابوں میں معجزات کے شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً کوئی ایسا دن نہیں گزرتا تھا جس میں امام جعفرصادقؑ سے کوئی معجزہ رونما نہ ہوتا ہو۔

امام جعفرصادقؑ کے معجزات کا ایک حصّہ صفوی دور کے بہت بڑے عالم و فاضل علاّمہ مجلسیؒ کی کتاب بحار الانوار میں بھی درج ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں مجلسی نے جو کچھ بھی بحار الانوار میں لکھا ہے وہ دوسرے منابع سے اقتباس ہے۔

امام جعفرصادقؑ کے معجزات کی تفصیل بیان کرنے والے شیعہ مورخین میں سے ایک ابو جعفر ابن بابویہ قمی ہیں یہ بزرگ جنھوں نے بہت مشہور کتاب مَن لایحضرہ الفقیہ لکھی، شیعوں کے بڑے علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور ان کا دورِ حیات چوتھی صدی ہجری تھا جو زمانے کے لحاظ سے امام جعفرصادقؑ کے قریب تھا۔

ابن بابویہ قمی نے معجزاتِ امام جعفرصادقؑ کے علاوہ اپنی ایک خاص کتاب "عیون اخبار الرضا" میں آپ کے پوتے امام علی ابن موسیٰؑ ابن جعفرؑ کے معجزات بھی

بیان کئے ہیں۔

چونکہ شیعہ مورخین امام جعفرصادقؑ کے لئے امامت کے قائل تھے لہٰذا ہم جیسا کہ پہلے بتا چکے ہیں ان میں سے بعض نے آپ کے علوم کی تعداد پانچ سو قرار دی ہے، بغیر اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کریں۔

البتہ ایک تاریخی محقق جب یہ دیکھتا ہے کہ آپ پانچ سو علوم سے واقفیت رکھتے تھے اور ان سب کا درس دیتے تھے تو اس بات کو تسلیم نہیں کرپاتا کہ ایک انسان اتنے علوم کا حامل ہوگا۔

بے شک امام جعفرصادقؑ کے عہد میں علوم کی تعداد آج کی مانند نہ تھی اور آگاہی میں آج کی سی تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ نہیں ہوا تھا اور ہنر کی وسعت اس بات کا سبب نہ بنی تھی کہ ایک کوتاہ مدت میں ایک علم سے دوسرے علوم وجود میں آجائیں۔

مثلاً ایٹم شناسی کے علم نے ایک قلیل مدت (۱۹۴۰ سے ۱۹۷۰ء) میں اس قدر وسعت اختیار کرلی ہے کہ آج ایک شخص نظری اور عملی لحاظ سے مکمل طور پر ایٹم شناس نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی ناکافی عمر اس سلسلہ میں رکاوٹ ہے کہ وہ عملی اور نظری ہر دو لحاظ سے ایٹم شناسی کا ماہر ہوجائے۔ اگر وہ ایٹم شناسی کے نظری شعبہ کو پیشِ نظر رکھے گا تو عملی شعبہ اس سے رہ جائے گا اور اسی طرح اگر وہ عملی شعبہ کی جانب قدم بڑھائے گا تو نظری شعبہ میں پیچھے رہ جائے گا۔

اسی مثال کو ہم جنگی مسائل میں بھی لے سکتے ہیں۔ امریکہ میں ہوائی جنگ کے حوالے سے ایک نئی ٹیکنیک وجود میں آئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے جنگی جہاز کو بغیر ہواباز کے اڑانا شروع کردیا ہے اور اس ٹیکنیک کی دریافت نے فضائی جنگ کی ٹیکنیک کو بدل دیا ہے اور فضائی جنگ میں ایک نئی ٹیکنیک دریافت کی ہے۔

لیکن ماضی میں ایسا نہ تھا اور علم و صنعت اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ تغیر سے دوچار نہ تھے۔ آج کے دور میں شاید اصلی اور فرعی علوم کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کرچکی ہو لیکن ساڑھے بارہ سو سال قبل علوم کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہ تھی۔

شیعہ مورخین نے یہ جو کہا ہے کہ امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم سے واقف تھے اور ہر ایک کی تدریس کرتے تھے' یہ مندرجہ ذیل دو عوامل کی بناء پر ہے۔

اوّل یہ کہ ان کا مذہبی عقیدہ تھا کہ امام جعفر صادقؑ امام ہیں اور شیعہ عقیدہ کے مطابق امامؑ اس کائنات میں دانائے مطلق ہے۔ یاد رہے کہ ان کی نظر میں علمِ مطلق دو نوع رکھتا ہے۔

ایک علمِ مطلقِ خداوند اور دوسرا علمِ مطلقِ پیغمبرؐ کہ جو آنحضرتؐ کے بعد امام کو حاصل ہوتا ہے۔

خداوندِ عالم کے علم کے بارے میں وہ کسی حد کے قائل نہیں اور اسے علمِ مطلق سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس کا علم خود اس کی مانند لامحدود ہے اور خداوندِ عالم کا علم اس کی ذات سے جدا نہیں کہ اسے اکتسابی سمجھا جائے۔

تمام مسلمان' خداوندِ عالم کی تمام صفات کو بشمول اس کے علم کو اس کی ذات کا جزو سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خداوندِ عالم کوئی مبداء و منتہا اور آغاز و انجام نہیں رکھتا اور اس کا علم بھی ابتداء و انتہا اور حدود کا حامل نہیں۔

کیا خداوندِ عالم جانتا ہے کہ اس کا کوئی آغاز و انجام نہیں اور کیا آگاہ ہے کہ وہ ازلی و ابدی ہے؟

مسلمان کا جواب ہے ہاں!

معترض کہتا ہے کہ اگر خدا جانتا ہے کہ آغاز نہیں رکھتا اور نہ ہی انجام کا حامل ہے تو اس نے خود کو کیسے پہچانا ہے؟ آیا شناسائی کے لئے لازم نہیں کہ مبداء اور منتہا سے واقف ہو؟

جواب ہے کہ جو علمِ مطلق ہو عین اس حال میں کہ جانتا ہے کہ اس کی مبداء و منتہا نہیں خود کو پہچانتا ہے کیونکہ علمِ مطلق ہماری کسی منطق کے قواعد کے قالب میں محدود نہیں ہوتا اور علمِ مطلق کہ جس کا مواد توانائی مطلق ہے اس قدر بسیط ہے کہ اس کو منطقی قواعد کے احاطہ اور نوع بشر کے استدلال میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

شیعہ جس دوسرے علمِ مطلق کے قائل ہیں وہ ہے پیغمبرؐ اور امامؑ کا علم۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کے علم کی حدود ان وظائف و ذمہ داریوں سے کہ جن کا خدا کی طرف سے ان کے لئے تعین ہوا ہے تجاوز نہیں کرتی ہیں اور دوسرے یہ کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کے علم کا پیمانہ خداوندِعالم کے علمِ مطلق کے جیسا نہیں ہے۔

شیعوں کے درمیان ایسے عرفاء پیدا ہوئے جن کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کا علم خداوندِ عالم کے علم جیسا ہوسکتا ہے اور علم اور اس کے نتیجہ میں توانائی کے لحاظ سے خدا اور پیغمبرؐ اور امامؑ کے مابین کوئی فرق نہیں۔

لیکن شیعہ علماء نے کسی دور میں عرفاء کے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا اور ہمیشہ خداوندِ عالم ہی کو خالق و عالمِ مطلق سمجھا ہے اور پیغمبرؐ اور امامؑ کو خداوندِ عالم کی مخلوق اور اس دنیا میں یعنی خداوندِ عالم کی خاص حدود کہ جس تک کسی اور کی فکر نہیں پہنچ سکتی کے سوا عالمِ مطلق سمجھا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ شیعہ علماء ہر دور میں اس بات کے معتقد رہے ہیں کہ امام اس دنیا میں یعنی خداوندِ عالم کے لئے مخصوص حدود کے سوا علمِ مطلق کا حامل ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو امامؑ نہ جانتا ہو اور نہ کرسکتا ہو علاوہ ان چیزوں کے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ وہ شیعہ مورخین جو امام جعفر صادقؑ کو پانچ سو علوم کا حامل سمجھتے ہیں پہلے مرحلے میں اسی مذہبی عقیدہ کے زیر اثر رہے ہیں۔

دوسرا عامل جس نے انہیں اپنے زیرِ اثر لیا وہ امام جعفر صادقؑ کا نبوغِ علمی تھا کیونکہ انہوں نے علوم کے بارے میں امام جعفر صادقؑ سے جو کچھ سنا تھا وہ ثابت کرتا تھا کہ آپؑ علمی میدان میں ایک غیر معمولی ہستی ہیں اور جن مورخین نے آپ کے علمی تبحر کو دیکھا تھا وہ سمجھتے تھے کہ ایسی ہستی تمام علوم کی مالک ہے اور کیونکہ امام محمد باقرؑ سے حدیث بھی نقل ہوئی کہ "علوم کی تعداد پانچ سو ہے" لہٰذا بعض شیعہ مورخین نے تحریر کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم جانتے اور ان کی تدریس کرتے تھے۔

ماضی میں دانشوروں کا طبقہ علم کی تقسیم کے بارے میں آج سے کہیں زیادہ سخی تھا

اور ہر علم کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

علمِ اعداد جو آج ایک علم ہے دورِ قدیم میں آٹھ علوم میں تقسیم ہوگیا تھا۔ اور عبارت تھا، جمع، تفریق، ضرب، تقسیم، جذر، کعب، تصاعد، جبر و مقابلہ۔ آج اس سب کو علمِ حساب کہا جاتا ہے اور لوگارتھم اور ٹرگنومیٹری اور حسابِ عالی بھی حساب ہی کا جزو ہوگئے ہیں اور سب کو ایک ہی علم شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح علومِ ادب میں، علم کے ہر جز کو ایک علم شمار کیا جاتا تھا۔ بحر کی شناخت ایک علم تھا اور قافیہ کی شناخت ایک اور علم اسم اولیٰ کو (علم بحور) رکھا گیا تھا اور دوسرے نام کو (علم قوافی)

بعض قدیم شعراء کسی ایک عرب شاعر کے تمام قصائد کو یاد کرنے کو بھی علم کہتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی عرب کے مشہور شاعر اعشی کے پانچ قصائد یاد کرلیتا تو دعویٰ کرتا کہ پانچ علوم کا حامل ہے۔

اس تقسیم بندی کے ساتھ تصدیق کی جاسکتی ہے کہ بعض شیعہ مورخین کے بقول امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم کو جانتے تھے اور ان کی تدریس کرتے تھے لیکن علم کی اس تعریف کے مطابق جو آج کا ذوقِ سلیم کرتا ہے یہ بات قابلِ قبول نہیں کہ (اگر صرف انسانی لحاظ سے فیصلہ کیا جائے) جعفر صادقؑ پانچ سو علوم کے حامل تھے۔

جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ آج ایک علم ممکن ہے کئی فروعات کا حامل ہو جن میں سے ہر ایک علم شمار ہو۔ طب کا علم دسیوں فروعی علوم میں تقسیم ہے جس میں سے ہر ایک جداگانہ ہوتے ہوئے بھی دوسرے طبی علوم سے ربط رکھتا ہے۔

علمِ طب کا ایک شعبہ سرطان شناسی ہے کہ جو بہت وسعت اختیار کرگیا ہے لیکن جو سرطان شناس ہو اسے لازماً طب کے دیگر شعبوں مثلاً قلب شناسی، گردش خون (Blood Pressure) اور علمِ اعصاب کے بارے میں کلیّات سے واقف ہونا چاہئے کیونکہ انسانی بدن کے تمام حصے انسانی اعضاء کے کاموں کے اعتبار سے باہم وابستہ ہیں اور جب کوئی سرطان کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے خون کی گردش اور اعصاب پر بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ارتباط کم و بیش دوسرے فرعی علوم میں بھی پایا جاتا

ہے۔

شیعہ علماء نے اسی دوسری صدی ہجری میں کہ جو امام جعفر صادقؑ کی صدی تھی آپؑ کے علوم کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کردیا تھا اور یہ طبقہ بندی اب تک موجود ہے۔

ان دو طبقوں میں سے ایک معقول ہے اور دوسرا منقول۔

آج علم کو ان شکلوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ علم منقول کو اس دور میں قبول نہیں کیا جاسکتا سوائے اس کے کہ ادب کو علم میں شمار کیا جائے۔

ادب کی گزشتہ انواع میں سے اب کوئی علم منقول پہلو کا حامل نہیں اور حتیٰ علمِ تاریخ مکمل طور پر منقول نہیں اور آج کا مورخ محض تاریخ کے اس حصے کو منقول سمجھتا ہے کہ جس پر عقلی لحاظ سے اظہار نظر نہیں کرسکتا۔

---☆---☆---

تاریخ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں

شیکسپیئر کے اشعار جو ادب کا جزو ہیں انہیں اسی صورت سے قبول کرنا چاہئے کیونکہ ایک منقول علم ہے لیکن آج کا مورّخ جنگِ واٹر لو کی تفصیلات کو منقول نہیں جانتا ہے۔ کیونکہ انہیں سمجھنے کے لئے عقل سے کام لیتا ہے جس طرح امام جعفر صادقؑ ساڑھے بارہ سو سال پہلے تاریخ کی تحقیق میں عقل استعمال کرتے تھے لہٰذا آپ تاریخ پر نقد و تبصرہ کے لحاظ سے آج کے مورّخ سے مختلف نہ تھے۔

یونانی مورّخ "ہرودوت" نے اپنی تاریخ کے ایک مقدمے میں لکھا ہے کہ جس چیز کو عقل قبول نہیں کرتی میں بھی اسے قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ اس تاریخ میں بھی خلافِ عقل اضافے پائے جاتے ہیں۔

اسلام میں امام جعفر صادقؑ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخی روایات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور نشاندہی کی ہے کہ انہیں بغیر غور و فکر اور نقد و تبصرہ کے تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آپ ہی تھے جو تاریخ لکھنے میں (ابن جریر طبری) کے استاد اور مرّبی بنے اور جب ابن جریر طبری نے تاریخ نویسی کے لئے قلم اٹھایا تو اسے آپ ہی کی وجہ سے معلوم ہوا کہ وہی چیزیں لکھنا چاہئیں جنہیں عقل قبول کرلے اور ایسے افسانوں سے اجتناب برتنا چاہئے جنہیں سن کر لوگوں کو نیند آنے لگے۔

امام جعفر صادقؑ سے قبل مشرق وسطیٰ میں تاریخ ایک ایسی چیز تھی جس کے بہت

سے حصے افسانوں کی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ جو لوگ تاریخ سنتے یا پڑھتے تھے وہ اس کے افسانوں کو تسلیم کرتے تھے۔

ایک احتمال کے مطابق اسلام سے قبل ایران میں تاریخ اور تاریخی کتابیں موجود تھیں جن کا ایک صفحہ بھی آج دستیاب نہیں ہے۔

ہخا منشیوں اور ساسانیوں کے جو مکتوبات دستیاب ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ایران میں یہ اصول رائج تھا کہ واقعات کو ضبطِ تحریر میں لاتے وقت قصّوں اور افسانوں کو تاریخ میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔

ہخا منشیوں اور ساسانیوں کے دور کے جو مکتوبات باقی رہ گئے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو قصّے کہانیاں بیان کرتا ہو بلکہ ان میں معتبر واقعات درج ہوئے ہیں البتہ اُن کے اندر اِن کے بادشاہوں کے مذہبی اثرات ضرور جھلک رہے ہیں؛ جن کے حکم سے یہ لکھے گئے ہیں۔ اگر قدیم ایران میں اس عقلِ سلیم اور حسنِ تشخیص کا وجود نہ ہوتا کہ تاریخ میں قصّے کہانی کا دخل نہیں ہونا چاہئے تو کم از کم کسی ایک ہی باقی ماندہ تحریر میں کوئی افسانوی چیز نظر آتی۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مکتوبات چونکہ مختصر تھے لہٰذا ان میں اس کی گنجائش ہی نہ تھی کیونکہ ہخامنشی بادشاہ دار یوش اوّل کا مکتوب بہتون (بہتان۔ بیتون) اور ساسانی بادشاہ شاپور اوّل کا نقشِ رستم دونوں چھوٹے مکتوب ہیں اگر چاہتے تو ان میں افسانوں کا اضافہ کرسکتے تھے لیکن سوائے تاریخ کے اور کچھ درج نہیں کیا۔ بہرحال چونکہ ایران میں قبلِ اسلام کی تاریخ کی کتابیں باقی نہیں ہیں لہٰذا نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں افسانوں کا وجود تھا یا نہیں۔(۱)

۱۔ خدائی نامہ جو شاہنامہ فردوسی کا ماخذ بنا ایک روایت کے مطابق ساسانیوں کے دور میں لکھا گیا اور ہمیں معلوم ہے کہ اس میں صرف قصے کہانیاں ہی تھیں۔ اس کے تاریخی افسانے ایک روایت کے مطابق اشکانیوں کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ (فارسی مترجم)

کہ خدا وندِ عالم جو دنیا کا خالق اور محافظ ہے وہ گراویٹون ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ قوی اور تیز رفتار کوئی اور چیز نہیں ہے۔ گراویٹون ایک لحظہ میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک (جس کی وسعت بقول آئین اسٹائن تین ہزار ملین نوری سال ہے اور آج کی تحقیق یہ ہے کہ یہ فاصلہ اس سے بھی زیادہ ہے) جاتا اور واپس آجاتا ہے۔ جب کہ برقی مقناطیسی قوت (Electromegnetic) آنے اور جانے میں چھ ہزار ملین نوری سال لیتی ہے۔ جو شخص آج گراویٹی فرقے کا پیرو ہے اس کی نظر میں دنیا کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا گراویٹون ہے اور جو شخص امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں دہریہ تھا اس کی نظر میں دنیا کا خالق اور منتظم دہرؑ (زمانہ) تھا اور وہ دینِ اسلام کے خدا کو نہیں مانتا تھا کیونکہ اس دین کے اصول ہی کا منکر تھا۔

اور آج جو شخص گراویٹی مذہب کا پیرو ہے وہ بھی مسیحیت کے خدا کی پرستش نہیں کرتا کیونکہ وہ تثلیث کا قائل نہیں ہے (لیکن بقول مضمون نگار) وہ دہریہ خدا پرست تھا جیسا کہ گراویٹی مذہب کا معتقد بھی خدا پرست ہے اگر ہم معرفتِ خدا کے لحاظ سے دہریئے کے بارے میں دہریئے کے عقیدے اور گراویٹون کے بارے میں جدید گراویٹی مذہب والے عقیدے کے درمیان فیصلہ کرنا چاہیں تو ماننا پڑے گا کہ جو شخص آج گراویٹون کو خدا مانتا ہے وہ خدا شناسی میں دہریئے سے بلند ہے کیونکہ یہ اپنے خدا کو اس سے بہتر پہچانتا ہے۔

جو شخص آج گراویٹون کو خدا جانتا ہے وہ آگاہ ہے کہ گراویٹون کم از کم نظامِ شمسی کے اندر اس عالم کی سب سے زیادہ قوی اور سریع الحرکت طاقت ہے (کیونکہ ابھی تجربے سے یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ نظامِ شمسی کے باہر بھی قوتِ جاذبہ اس دنیا کی مانند کام کرتی ہے) جو ایک لحظہ میں نظامِ شمسی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتی اور واپس آجاتی ہے کوئی چیز اس کو روک نہیں سکتی اور یہ سورج کے قلب سے بھی جہاں درجہ حرارت بیس ملین ڈگری سے زیادہ ہوتا ہے، عبور کر جاتی ہے۔ اسی طرح ستاروں کے درمیان وسیع فضاؤں سے گزرتی ہے جہاں مطلق صفر برودت کی

کارفرمائی ہے۔

برقی رو کو تو کسی ذریعے سے روکا جاسکتا ہے لیکن گراویٹون کے گزرنے کو کسی ذریعے سے نہیں روکا جاسکتا اور یہ جس آسانی کے ساتھ ایک آہنی دیوار سے گزرتا ہے اسی طرح چینی یا بلور کی دیوار سے بھی گزر جاتا ہے۔ گراویٹون خود انسانی خون کے ہر ذرہ میں موجود ہے جس طرح سورج اور نظامِ شمسی کے دیگر کروں میں بلکہ قوی احتمال ہے کہ دوسرے شمسی نظاموں اور کہکشانوں میں بھی موجود ہے۔

آج گراویٹون کو خدا ماننے والا جانتا ہے کہ گراویٹون کی سرعت چونکہ فوری ہوتی ہے لہٰذا وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر پایا جاتا ہے اور موجوداتِ عالم کے تحفظ میں (کم از کم اس نظامِ شمسی کے اندر) یہ اس قدر موثر ہے کہ اگر قوتِ جاذبہ کی روانی ایک لمحے کے لئے منقطع ہوجائے تو نہ صرف اجسام کا ریشہ ریشہ ایک دوسرے سے جدا ہوجائے بلکہ ان ریشوں کے اندر ایٹم بھی ایک دوسرے سے جدا اور ہر ایٹم کے اندر الیکٹران بھی مرکزی نقطے سے الگ ہوجائیں۔ نتیجہ یہ ہو کہ مادہ جو منجمد یا سیال یا بخارات کی صورت میں ہے فنا ہوجائے، بلکہ اگر ہم اس سے زیادہ آسان زبان میں کہیں تو یہ ہستی اور یہ کائنات جو نظر آرہی ہے کم از کم نظامِ شمسی کے اندر فنا و نابود ہو کر رہ جائے اور یہ عمل صرف ایک لحظہ کے اندر انجام پاسکتا ہے۔ دنیا میں اس سے بڑا کوئی سانحہ نہیں ہوسکتا کہ گراویٹون یا قوتِ جاذبہ کی رفتار ایک لحظہ کے لئے رک جائے، کیونکہ اسی لحظہ میں نہ صرف یہ کہ مادہ فنا ہوجائے گا بلکہ انرجی بھی ختم ہوجائے گی کیونکہ انرجی کی بقاء بھی برقی طاقت اور (Electromagnetic) بجلی اور مقناطیس کی طاقت کی طرح قوتِ جاذبہ سے وابستہ ہے۔

آج گراویٹون کو خدا ماننے والا انسان واقف ہے کہ مادہ بغیر قوتِ جاذبہ کے باقی نہیں رہ سکتا جس طرح بغیر اس کے انرجی باقی نہیں رہ سکتی۔ وہ نہیں جانتا کہ گراویٹون کیا شئے ہے جس طرح یہ نہیں جانتا کہ برقی طاقت کیا چیز ہے البتہ جس طرح برقی طاقت کے وجود پر ایمان رکھتا ہے کیونکہ اس کے خواص سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح گراویٹون

کی موجودگی پر بھی یقین رکھتا ہے۔ جو شخص آج گراویٹون کو خدا مانتا ہے۔ وہ قوتِ جاذبہ کے قانون سے بھی باخبر ہے۔ درحالیکہ ساڑھے بارہ سو سال قبل جو شخص دہر (زمانے) کو خدا مانتا تھا وہ دہر کے اصل قانون سے مطلع نہیں تھا اور اس بارے میں اس کی اطلاعات محسوسات کی حدود مثلاً فصلوں کے تغیر سے آگے نہیں بڑھی تھیں۔

جو شخص آج گراویٹون کو کائنات کا خالق اور منتظم مانتا ہے وہ جانتا ہے کہ مادے اور انرجی کا راز گراویٹون میں ہے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مادہ اور انرجی کیونکر وجود میں آئے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ گراویٹون کیا ہے' اور کیونکر وجود میں آیا؟ اگر یہ راز آشکار ہوجائے تو مادہ اور انرجی کہ جنہیں قدیم زمانے میں جسم و روح کہا جاتا تھا کے تمام اسرار منکشف ہوجائیں گے۔ یہاں تک کہ حکماءِ یونان نے روح پر حرکت کا بھی اضافہ کیا تو اس کے بعد مادے یا جسم کا راز ایک ہوا اور حرکت و روح کا راز ایک۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ گراویٹی مسلک کے پیروکاروں کا عقیدہ جو اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ——— گراویٹون خدا ہے' یا یہ کہ قوتِ جاذبہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے طبیعی لحاظ سے شاید ایک حقیقت نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر کہا جاسکتا ہے کہ علمِ فزکس قوتِ جاذبہ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت مانتا ہے۔ لیکن چونکہ نوع بشر اس نظامِ شمسی سے باہر کے قوانین سے بخوبی واقف نہیں ہے لہٰذا یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ قوتِ جاذبہ کائنات کی سب سے بڑی اور زمین کو خلق کرنے والی واحد طاقت ہے اور دوسری تمام طاقتیں اسی سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جس روز انسان دیگر شمسی نظاموں کے طبیعی قوانین کی تہہ تک پہنچ جائے تو سمجھ لے کہ قوتِ جاذبہ کائنات کی فروعی طاقتوں میں سے ایک ہے اور اصلی طاقت کوئی دوسری ہے اور شاید اسی طرح ایک دن ایسا آئے جب یہ معلوم ہو کہ تمام پیشِ نظر طبیعی قوانین ایک ایسے مثبت سائے یا جسم کا منفی سایہ یا جسم ہیں کہ جہاں تک ہماری نظر نہیں پہنچتی اور طبیعات کا ہر قانون دوہرا ہے جس میں سے ایک' دوسرے قانون کا سایہ یا جسم قرار پاتا ہے لیکن ہم اپنی دنیا میں صرف ایک ہی کو دیکھتے ہیں اور دوسرے کا مشاہدہ نہیں کرسکتے جو ہوسکتا ہے

اصلی سایہ یا جسم ہو جو چیز ذہن کو اس مفروضے کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ضدِ مادہ کی تحقیق ہے اور یہ وہ مادہ ہے جس کے ایٹموں میں الیکٹران مثبت ہوتے ہیں اور پروٹان منفی۔ لیکن ابھی تک یہ کوئی نہیں جانتا کہ جو عناصر ضدِ مادہ کے ایٹموں سے وجود میں آئے ہیں (اگر ایسا ہوا ہو) تو وہ کیا ہیں اور کون سے فزکی اور کیمیائی خواص کے حامل ہیں؟

اور جب ایٹم میں ضد مادہ کا پتہ لگالیا گیا تو یہ مفروضہ وجود میں آیا کہ شاید ایٹم کی ایک دوسری قسم بھی موجود ہو جس کے اجزاء کا برقی دباؤ کوئی دوسری شکل رکھتا ہو۔

باوجودیکہ ہمیں یقینی طور پر علم نہیں کہ آیا قوتِ جاذبہ سب سے بڑی طاقت اور کائنات کی اصلی قوت ہے یا کسی دوسری طاقت کی شاخ ہے لیکن چونکہ ہمارے نظامِ شمسی میں دوسری طاقتوں پر اس کی برتری ثابت ہے لہٰذا جو شخص گراویٹی مذہب رکھتا ہے اور گراویٹون کو خدا مانتا ہے اس کی خدا شناسی اس شخص سے زیادہ ہے جو امام جعفر صادقؑ کے دور میں دہریہ تھا اور دہر کو خدا مانتا تھا۔

اگرچہ بالآخر یہی ثابت ہوا کہ آج گراویٹی مسلک کا پیرو بھی سابق دہریے کی مانند دھوکا کھا گیا اور خدا نہ گراویٹون ہے نہ دہر۔ البتہ جو شخص آج گراویٹون کو خدا مانتا ہے اس نے اس کی تحقیق میں قدیم دہریے سے زیادہ کوشش کی ہے۔

شاید یہ کہا جائے کہ گراویٹی مسلک والوں نے خدا کو پہچاننے کے لئے خود زیادہ جدوجہد نہیں کی بلکہ دوسروں نے کوشش کرکے گراویٹون کو معلوم کیا اور پھر اس کا تعارف کرایا یعنی اہلِ علم نے بغیر اسے خدا جانے ہوئے اس کی شناخت کی زحمت اٹھائی لیکن اس بات سے گراویٹی مسلک والوں کے عقیدے کا وزن کم نہیں ہوتا' کیونکہ آدمی خدا شناسی کے مرحلے میں یا اپنی کوشش سے کام لیتا ہے یا دوسروں کی سعی سے استفادہ کرتا ہے۔

ایک محقق کا مطمحِ نظریہ ہے کہ حصولِ علم خدا کی معرفت میں معاون ہوتا ہے اور آدمی یا تو اپنی ہمت اور کاوش سے علم حاصل کرتا ہے یعنی استنباط و انکشاف کرتا ہے یا

دوسروں سے کسبِ فیض کرتا ہے اور مخصوص اور عالی دماغ افراد کے علاوہ جو علمی مراحل میں خود ہی کشف و تحقیق کا کام کرتے ہیں، عام اشخاص دوسروں سے علم حاصل کرتے ہیں، جیسا کہ امام جعفر صادقؑ جو کہ اپنے عہد میں ایک بہت لائق و فائق دانشمند تھے جن سے شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں کے پیرو علم حاصل کرتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ نے شیعوں کی مذہبی تہذیب و ادب کی بنیاد صرف ایمان پر نہیں رکھی تھی بلکہ علم کو اس کا ایک اہم رکن قرار دیا تھا۔ آپ نے مذہبِ شیعہ کی بقاء کے لئے جو اصول وضع کئے تھے ان پر یقین بھی رکھتے تھے اور آپ کے اس یقین و ایمان کی دلیل یہ ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دن تک فیض پہنچانے میں مشغول رہے اور جو علوم آپ جانتے تھے وہ دوسروں کو بھی سکھاتے تھے، جب کہ اس سلسلے میں کسی سے ایک پیسہ اجرت نہیں لیتے تھے۔ آپ بغیر کوئی حقِ تعلیم وصول کئے نہ صرف یہ کہ ساری عمر تعلیم و تدریس میں مشغول رہے اور جو علوم آپ کے پاس تھے وہ دوسروں کو سکھاتے رہے بلکہ جو لوگ آپ کی درس گاہ میں علم حاصل کرتے تھے اگر ان میں سے کسی کو ضرورت مند پاتے تھے تو اپنے پاس سے مالی اعانت بھی فرماتے تھے اور وہ بھی اس صورت سے کہ کسی دوسرے شاگرد کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ آپ پیسوں سے کتابیں خرید کر شاگردوں کو دیتے تھے۔ اگر کسی کتاب کا کوئی نسخہ کسی ایک کے لئے مخصوص ہوتا تھا اور تمام شاگردوں کو اس کے مطالعے کی ضرورت ہوتی تو کاتبوں کو اجرت دے کر اس کے متعدد نسخے تیار کراتے تھے۔

چونکہ امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں ایسے علوم کا درس دیا جاتا تھا جو اس سے قبل اسلام میں رائج نہ تھے اور دوسرے لوگوں نے ان پر کتابیں لکھی تھیں۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ جو شاگرد غیر ملکی زبانیں نہیں جانتے تھے وہ بھی ان سے استفادہ کرسکیں اور بعید نہیں ہے کہ عربی زبان میں غیر ملکی کتابوں کے ترجمے کی تحریک جس نے بغداد میں دوسری صدی ہجری سے وسعت پائی اور خلفائے بنی عباس بھی اس کے شائق بنے اور پھر بعض مترجمین کو دردناک طریقے سے

قتل بھی کیا، امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ سے ہی اخذ کی گئی ہو۔

آپ کی درس گاہ میں علمی قوانین کو سمجھنے کے لئے تجربات بھی کئے جاتے تھے۔ فطری طور پر ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ اس عظیم دانشمند کے یہاں دورِ حاضر کی بڑی بڑی تجربہ گاہوں کی مانند کوئی تجربہ گاہ موجود تھی جس میں فزکی اور کیمیائی قوانین کی آزمائش کی جاتی ہو۔ آپ کی تجربہ گاہ اسی دور کے لحاظ سے تھی لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آپ علوم کے بارے میں صرف تھیوری پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ حتیٰ الامکان اسے تجربے کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ اس حقیقت کی طرف متوجہ تھے کہ ہوا ایک عنصر نہیں ہے اور بغیر تجربے کے اس موضوع کی تہہ تک پہنچنا بعید معلوم ہوتا ہے۔

شیعوں کے لئے امام جعفر صادقؑ کا علم کوئی غیر معمولی شئے نہیں ہے کیونکہ وہ آپ کو امامؑ مانتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپؑ علمِ امامت سے ہر چیز جانتے تھے۔ اور اسی بناء پر آپ کا کوئی معجزہ بھی ان کی نگاہوں میں بعید از قیاس نہیں ہے چنانچہ آپ کے تمام معجزات کو جو شیعہ مورخین کی کتابوں میں آپ کی طرف منسوب ہیں، بے چون و چرا قبول کرلیتے ہیں لیکن ایک غیر جانبدار مورخ جس وقت امام جعفر صادقؑ کا یہ قول سنتا ہے کہ ہوا بسیط عنصر نہیں ہے بلکہ کئی اجزا سے مل کر بنی ہے جن میں سے ایک جزو اشیاء کو جلانے کا باعث ہوتا ہے نیز بعض اشیاء کو فاسد کرتا ہے تو وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ آپ نے کیونکر اس کی تحقیق کی تھی؟

امام جعفر صادقؑ کا معجزہ یہ نہیں تھا کہ آپ پہاڑ کو جنبش میں لے آئے، کیونکہ (مضمون نگار کے خیال میں) یہ عقلی حیثیت سے قابلِ قبول نہیں، بلکہ آپ کا اعجاز یہ ہے کہ آپؑ نے آج سے ساڑھے بارہ سو سال پہلے ہوا میں آکسیجن کی موجودگی کا پتہ لگایا اور اسی موقع پر یہ بھی معلوم کرلیا کہ پانی میں ایک ایسی چیز ہے جو جل جاتی ہے اور اسی بنیاد پر فرمایا کہ پانی آگ میں بدل جاتا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک پیغمبر کا سب سے اہم معجزہ اس کا کلام ہے، مثلاً یہ کہ

وہ بغیر کسی بنیاد کے کوئی بات نہیں کہتے' وہ ہمارے مانند ہیں کیونکہ آج جب ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے کوہِ صفا کو متحرک کردیا تھا اور پہاڑ آپ کے پاس آگیا تھا' تو ہم اس روایت پر یقین نہیں کرسکتے اور ہماری طبیعت قبول نہیں کرتی کہ آپ نے ایسا معجزہ دکھایا ہوگا' لیکن جب ہم یہ سنتے ہیں کہ آپ نے دوسری صدی ہجری کے ابتدائی نصفِ اوّل میں آکسیجن نیز پانی کے اندر ہائیڈروجن کے وجود کا پتہ لگالیا تھا تو ہمارا دل تصدیق کرتا ہے کہ یہ اعجاز ہے۔کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد کے وسیلے سے جو خود بھی بڑے عالم تھے پانی کے اندر ہائیڈروجن کا پتہ لگایا اور اس کے بعد آپ نے خود معلوم کیا کہ ہوا میں آکسیجن موجود ہے۔ افسوس کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ آیا آپ خالص آکسیجن اور ہائیڈروجن حاصل کرسکے یا نہیں؟ بظاہر خالص ہائیڈروجن اور آکسیجن کا پتہ لگانے کے لئے انہیں حاصل کرنا لازمی ہے اور خالص ہائیڈروجن کا حاصل کرنا خالص آکسیجن حاصل کرنے سے زیادہ دشوار ہے۔ کیونکہ آکسیجن تو خالص حیثیت سے فطرت (ہوا) میں موجود ہے لیکن ہائیڈروجن اس طرح سے نہیں ہے اسی وجہ سے بعد کے زمانوں میں جب تک پانی کا تجزیہ نہیں کیا گیا خالص ہائیڈروجن حاصل نہیں ہوسکی۔

انسان مبہوت ہوجاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ یا آپ کے والد امام محمد باقرؑ نے ہائیڈروجن گیس کے وجود کا کہ جو خالص طور سے طبیعت کے اندر موجود نہیں ہے اور کوئی رنگ و بو اور ذائقہ بھی نہیں رکھتی، کیونکر پتہ لگا لیا؟ امام جعفر صادقؑ اور آپؑ کے پدرِ بزرگوار کے لئے ممکن نہ تھا کہ پانی کے علاوہ ہائیڈروجن کا پتہ لگائیں' اور بغیر پانی کا تجزیہ کئے ہوئے اس کی شناخت کرسکیں اور پانی کا تجزیہ بھی برقی رو سے کام لینے پر منحصر تھا۔ کیونکہ کسی دوسرے طریقے سے پانی کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا تو کیا ان دونوں حضرات میں سے کوئی ایک بھی پانی کے تجزیے کے لئے برقی رو سے استفادہ کرسکتا تھا؟

لیکن یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ جدید دور میں سب سے پہلا شخص جو ہائیڈروجن کو پانی سے جدا کرنے میں کامیاب ہوا وہ انگلینڈ کا ہنری کاونڈیش ہے اور جس

نے اکیاسی سال کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں وفات پائی اس نے سالوں پانی پر تجزیہ کی کوشش کی اور ہائیڈروجن حاصل کرنے کے بعد اس کا نام آتش گیر ہوا رکھا۔ جب اس نے پہلی بار ہائیڈروجن کو مشتعل کیا تو قریب تھا کہ خود وہ اور اس کا گھر بھی جل جائے۔ کاونڈیش نے ۲۷ مئی ۱۷۶۶ء کو ہائیڈروجن سے بھرے ہوئے ایک ظرف کو شعلہ دکھایا تو وہ یکدم جل اٹھا اور پھٹ گیا جس سے چاروں طرف آگ پھیل گئی اور اس کے ہاتھ اور تھوڑا چہرہ بھی جل گیا۔ اگر اس کی چیخ سن کے گھروالے نہ دوڑے ہوتے اور آگ نہ بجھاتے تو اس کا گھر اور تمام اثاثہ سب جل کر خاکستر ہوجاتا۔

اس دانشمند نے دو وجوہ کی بنا پر اس گیس کا نام آتش گیر ہوا رکھا تھا۔ ایک تو یہ کہ ایک تلخ تجربے سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ یہ گیس مشتعل ہوجاتی ہے' دوسرے یہ کہ قدماء کے خیال میں پانی ایک سیال ہوا تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ جب پانی کو حرارت پہنچتی ہے تو وہ بھاپ بن کر فضاء میں پھیل جاتا ہے نیز ان کا مشاہدہ تھا کہ پانی بارش کی صورت میں فضاء سے نیچے آتا ہے لہٰذا سوچتے تھے کہ پانی سیال ہوا کے سوا اور کچھ نہیں اور اسی بناء پر کاونڈیش نے اس گیس کا نام آتش گیر ہوا رکھا۔

ہائیڈروجن کا نام عربی زبان میں مولدا لماء (یعنی پانی پیدا کرنے والی) ہے۔ یہ نام مشہور فرانسیسی دانشمند لاوازیہ نے جسے گلوٹین سے قتل کیا گیا' تجویز کیا تھا اور لاوازیہ نے یہ نام جب تک وضع نہیں کیا یورپی ممالک میں اسے آتش گیر ہوا ہی کہا جاتا تھا۔ ہائیڈروجن گیس کا انکشاف اس زمانے میں ہوا جب برقی طاقت کا استعمال اس قدر ترقی کرچکا تھا کہ اس کے ذریعے پانی کا تجزیہ کیا جاسکے۔

البتہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں برقی قوت سے صرف کہربا اور کاہ (گھانس) کی حد تک کام لیا جاتا تھا۔ جس کا مقصد شعبدہ بازی اور بازی گری تھا۔ کہربا کے ایک ٹکڑے کو اونی کپڑے پر رگڑ کر اسے گھانس کے قریب لے جاتے تھے تو کہربا گھانس کی پتیوں کو کھینچ لیتا تھا۔

آیا امام جعفر صادقؑ یا ان کے والدِ بزرگوار امام محمد باقرؑ نے ہائیڈروجن کو پانی سے

روشنی کا نظریہ اور امام جعفر صادقؑ

امام جعفر صادقؑ کی علمی اختراعات میں سے ایک روشنی کے بارے میں آپ کا نظریہ ہے۔آپ نے فرمایا ہے کہ نور دیگر اشیاء کی طرف سے ہماری آنکھ کی جانب آتا ہے اور اس میں سے صرف ایک ہی حصہ ہماری آنکھ میں چمکتا ہے جس کی وجہ سے ہم دور کی چیزوں کو بخوبی نہیں دیکھ سکتے۔ اگر وہ تمام نور جو کسی دور کی چیز سے ہماری آنکھ کی طرف آتا ہے دیدے کے اندر پہنچ جائے تو ہمیں دور کی چیز قریب نظر آئے گی۔ اگر کوئی ایسا آلہ بنایا جاسکے جس کے ذریعے دور کی چیز سے آنے والا تمام نور آنکھ کے اندر چمکا دیا جائے تو صحرا کے اندر جو اونٹ تین ہزار گز کے فاصلے پر چر رہا ہے اسے ہم ساٹھ گز کے فاصلے پر دیکھیں گے یعنی وہ ہمیں پچاس گنا قریب نظر آئے گا۔

یہ نظریہ امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں کے ذریعے ہر طرف پھیل گیا اور جب صلیبی جنگوں کے بعد مشرق و یورپ کے درمیان تعلقات قائم ہوئے تو یورپ میں منتقل ہوگیا اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جانے لگا۔ اس نظریئے کا ایک مشہور مدرّس انگلینڈ کی آکسفورڈ یونیورسٹی کا استاد ڈاکٹر راجر بیکن بھی تھا۔ نور کے بارے میں اس کی تھیوری بھی وہی ہے جو امام جعفر صادقؑ نے بتائی تھی۔ اور آپ کی مانند اس نے بھی یہی کہا ہے کہ اگر ہم کوئی ایسا آلہ بنائیں جو دور کی تمام اشیاء کا نور ہماری آنکھوں میں پہنچا دے تو ہم ان اشیاء کو پچاس گنا زیادہ قریب دیکھیں گے۔

اسی نظریئے کی بناء پر ۱۶۰۸ء میں لپرشی فلا مانڈی (LIPPERSHEY) نے پہلی دوربین ایجاد کی اور اسی نمونے کو سامنے رکھ کر مشہور سائنس دان گیلیلو اپنی فلکی دوربین بنانے میں کامیاب ہوا۔ اسی نے اپنی اس دوربین سے ۱۶۱۰ء کے پہلے مہینے یعنی ۷ جنوری کی شب میں کام لیا اور آسمانی ستاروں کا مشاہدہ کیا۔

جیسا کہ ہمارے پیشِ نظر ہے تاریخ میں اس کے موجد لپرشی اور گیلیلو کے دوربین بنانے کے درمیان دو سال سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ اور چونکہ گیلیلو نے ۱۶۱۰ء کے پہلے ہی مہینے میں اپنی دوربین سے کام لینا شروع کردیا تھا لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ فاصلہ دو سال سے بھی کم ہے اور اس طرح بعید نہیں کہ فلکی دوربین بنانے کا خیال ایک ہی موقع پر دونوں کے ذہن میں آیا ہو۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گیلیلو نے لپرشی کی دوربین سے رہنمائی حاصل کی اور جو نقص اس میں باقی رہ گیا تھا اسے اس زمانے کے ٹیکنیکی امکانات کی حدود میں رفع کرکے اس سے ۷ جنوری ۱۶۱۰ء کی شب میں آسمان کا نظارہ شروع کیا۔

گیلیلو ملک پاٹا ویوم کی مشہور یونیورسٹی کا تربیت یافتہ تھا جو بعد میں (وینس) (VENICE) سے موسوم ہوئی اور آج اس کی کرسی کو وینس کہتے ہیں اور اسے مشرق پاٹا ویوم یا ونی ئی میں بندقیہ کہا جاتا تھا۔ گیلیلو ریاضی کا استاد بن گیا۔ جب اس نے پہلی شب اپنی دوربین کا رخ چاند کی طرف کیا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ زمین کی طرح چاند پر بھی پہاڑوں کا ایک سلسلہ موجود ہے اس نے دیکھا کہ یہ پہاڑ، چاند کے صحراؤں پر سایہ ڈال رہے ہیں۔ چنانچہ اس کی سمجھ میں آیا کہ دنیا صرف زمین ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ چاند بھی ایک دنیا ہے۔

اگر نور کی تھیوری امام جعفر صادقؑ کی طرف سے پیش نہیں کی گئی ہوتی تو کیا لپرشی فلامانڈی اور گیلیلو فلکی دوربین بنا سکتے تھے؟ گیلیلو نظامِ شمسی کے اجرام کا مطالعہ کرسکتا تھا؟ اور اپنے مشاہدے سے کوپرنیک اور کپلر کے اس نظریئے کی تائید کرسکتا تھا کہ نظامِ شمسی کے اجرام جن میں زمین بھی شامل ہے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔

گیلیلو کی طرف سے دوربین کی ایجاد نے لوگوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وینس کے ممبرانِ پارلیمنٹ سے صدرِ جمہوریہ تک سبھی اس کے ذریعے ستاروں کا معائنہ کرنے کے شائق بن گئے۔ گیلیلو اپنی دوربین کو پادو سے جہاں مشہور یونیورسٹی تھی اور ہے' وینس لے آیا اور اسے ایک کلیسا کے بُرج پر نصب کیا۔ عمر رسیدہ سینیٹرز بھی سہارا دے کر اس بُرج تک پہنچائے گئے تاکہ وہاں سے اس دوربین کے ذریعے چاند اور ستاروں کو دیکھ سکیں۔

جب گیلیلو سے پوچھا جاتا تھا کہ اس کی دوربین اجرامِ فلکی کو اس قدر قریب کس طرح کردیتی ہے کہ اس سے چاند کے پہاڑ بھی دیکھے جاسکتے ہیں؟ تو وہ امام جعفر صادقؑ کی پیش کی ہوئی تھیوری دہراتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ دوربین اجرامِ سماوی کے اس سارے نور کو جو آنکھوں کی طرف آتا ہے جمع کرلیتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو چیز تین ہزار قدم کے فاصلے پر ہو وہ اس قدر نزدیک آتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ساٹھ قدم کے فاصلے پر ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ گیلیلو کی ایجاد کے بعد جب عطارد' زہرہ اور مشتری کے چاندوں کے مراحل آنکھوں سے دیکھے گئے تو کوپرنیک اور کپلر کے نظریئے کی تائید میں اس نے کیا اثرات مرتب کئے۔

یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ معروف حکیم اور مشہور مشائی فلسفے کے حامل ارسطو اور اس کے پانچ سو سال بعد آنے والے بطلیموس نے تیسری صدی قبلِ مسیح سے پندرھویں صدی عیسوی تک یعنی اٹھارہ سو سال کی مدت تک علمِ نجوم کو پیچھے دھکیل دیا۔

ارلیس تارخوس جیسے چند حکماء نے یہ کہا تھا کہ زمین اپنے گرد اور ساتھ ہی سورج کے گرد گھومتی ہے۔ چنانچہ اپنے گرد زمین کی گردش سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں اور سورج کے گرد زمین کی گردش سے سال کے موسم۔

ارسطو ایک مفکر اور عظیم فلسفی تھا اور اس کی کتابیں "قانون" اور "فزکس" وغیرہ

علم و ادب کی زندہ و جاوید کتب شمار کی جاتی ہیں لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہیئت کے بارے میں اس نے اٹھارہ سو سال تک بشریت کو جہالت کے اندھیرے میں رکھا — اور انسان کو اس کا موقع نہیں دیا کہ اپنے کو اس ظلمت کدے سے نجات دے اور جرأت سے کہا جاسکتا ہے کہ ارسطو نے اتنے طویل عرصہ تک ہماری علمی پیشقدمی کو روکے رکھا۔ اگر وہ یہ نہ کہتا کہ زمین ساکن اور ثابت ہے اور سورج اور دیگر ستارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں تو نمایاں علمی ترقی جو عہدِ جدید میں یورپ میں ہوئی ہے کم ازکم پہلی صدی عیسوی سے شروع ہوچکی ہوتی۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دورِ جدید میں یورپ کا یہ علمی ارتقاء جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے' کوپرنیک لہستانی نے شروع کیا جس نے کہا تھا کہ زمین' سورج کے گرد گھومتی ہے اس کے بعد جرمنی کے کپلر نے اس کو تقویت دی' جس نے سیاروں کی جن میں زمین بھی شامل ہے' سورج کے گرد حرکت کے قوانین کا انکشاف کیا۔ اسے بعد میں گیلیلو نے مزید تقویت پہنچائی جس نے سورج کے گرد سیارات کی حرکت کو محسوس اور چشم دید طریقے سے ثابت کیا۔ اگر یہ تینوں افراد پیدا نہ ہوتے اور چالیس ہزار آٹھ سو سالہ نوعِ بشر کو زمین کے ثبات اور اس کے گرد سورج کی گردش کے نظریئے سے الگ نہ کرتے تو ڈیکارٹ وجود میں نہ آتا جو اپنے ایجاد کردہ طریقے (Method) کے ذریعے جدید علمی تحقیقات کی بنیاد مضبوط کرتا۔ اس طرح وہ بھی دوسرے ان دانشمندوں کی طرح سترھویں صدی سے کوپرنیک کی آمد کے دور تک جہالت کے اندھیرے میں رہتے جو ارسطو کا پیدا کیا ہوا تھا۔

جس وقت گیلیلو نے ۱۶۱۰ء میں پہلی بار اپنی فلکی دوربین کا رخ آسمان کی طرف کیا تو ڈیکارٹ چودہ سال کا تھا اور وہ کوپرنیک' کپلر اور گیلیلو کے بغیر خود کو جہالت کے اندھیرے سے نکال کر عہدِ جدید کی علمی تحقیق کی بنیاد استوار نہیں کرسکتا تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ علوم زنجیر کے حلقوں کی مانند ہیں' لیکن ایک حلقہ دوسرے حلقے سے ملحق ہوتا ہے اور ایک علم سے دوسرا علم دریافت ہوتا ہے۔ سورج کے گرد سیارات اور زمین کی حرکت کے موضوع پر نوعِ بشر کی جہالت نے جس کا باعث ارسطو بنا اٹھارہ

صدیوں تک علمی فضا میں انسان کے پر پرواز کو معطل رکھا اور بزرگ استاد و معلم ارسطو کا اثر و نفوذ اتنا زیادہ تھا کہ کوئی شخص اس کے نظریئے کو باطل کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

اقوامِ عالم میں ارسطو کے نظریہ کو دو اور چیزوں کی وجہ سے بھی تقویت حاصل ہوئی۔ اوّل یہ کہ مصر کے مشہور جغرافیہ داں بطلیموس نے جو ارسطو کے پانچ سو سال بعد آیا اس کے نظریئے کو درست قرار دیا اور ستاروں کی حرکات کے سلسلے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ سیارے ایسی چیزوں کے گرد گھوم رہے ہیں جو متحرک ہیں اور چیزیں زمین کے گرد گھومتی ہیں لیکن زمین بے حس و ساکت ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، بطلیموس نے زمین کے گرد سیاروں کی گردش کے دو درجے قرار دیئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ چند چیزوں کے گرد گردش کرتے ہیں اور وہ چیزیں اپنی جگہ پر ثابت و ساکن زمین کے گرد گھومتی ہیں۔

دوسری چیز یہ کہ یورپ میں مسیحی کلیسا نے ارسطو کے نظریئے کی تائید کی اور کہا کہ ارسطو نے زمین کے ساکت اور مرکزِ عالم ہونے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بلاشبہ ایک حقیقت ہے، کیونکہ اگر زمین ساکت اور مرکزِ عالم نہ ہوتی تو خدا کے بیٹے حضرت مسیحؑ اس میں ظاہر نہ ہوتے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوپرنیک، کپلر اور گیلیلیو پیدا نہ ہوتے تو ڈیکارٹ پیدا ہوتا جو جدید علمی تحقیق کی بنیاد رکھتا اور اس کے بعد بھی علم کی پیش رفت ہوتی، یہاں تک کہ آج کے موجودہ مرحلے تک پہنچ جاتا۔ البتہ دورِ حاضر کے دانشمند اس نظریئے کے حامی نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک اس صدی کے نیمۂ اوّل کا برطانوی ماہرِ طبیعیات ایڈنگٹن ہے جس نے ۷۵ سال کی عمر میں ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔

جس شخص نے بھی فزکس پر کام کیا ہے وہ ایڈنگٹن سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ موجودہ صدی میں فزکس کی ترقی میں اس کا کتنا حصہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ارسطو کا (مذکورہ بالا) نظریہ جس کی بعد میں بطلیموس نے توثیق کی سولہویں صدی عیسوی تک علم پر کابوس

نہیں ہوسکا۔ اور وٹیکن کو متوجہ نہ کرسکا۔

قوی احتمال یہی ہے کہ جن لوگوں نے اس کے رسالے کو پڑھا انہوں نے اس کے قول پر یقین نہ کرتے ہوئے اسے محض ایک شوخی سمجھا۔ نیکولاڈوکوزا کی تحریر اس لئے ایک شوخی معلوم ہوتی تھی کہ اس میں بدیہیات کا انکار کیا گیا تھا۔ یعنی ایسی چیز کا انکار جس کے وجود میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

ریاضیات کے بابا آدم فیثا غورث نے اپنے مقدمہ ہندسہ میں ایک اصول کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بدیہی مسائل میں سے ہے جس کے اثبات کی ضرورت نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ دس عدد پانچ سے زیادہ ہوتے ہیں اور یہ ایسا بدیہی مسئلہ ہے کہ اسے ثابت کرنے کے لئے ہمیں دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح پانچ رطل چار رطل سے زیادہ وزنی ہوتے ہیں اور اس کے بدیہی ہونے کی وجہ سے اس پر دلیل قائم کرنا ضروری نہیں۔ اسی طرح سورج اور ستاروں کی حرکت محتاجِ ثبوت نہ تھی کیونکہ آغازِ خلقت ہی سے نوعِ بشر اپنی دونوں آنکھوں سے برابر دیکھ رہی تھی اور دیکھ رہی ہے کہ سورج اور ستارے زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔

زمین کا ساکت اور غیر متحرک ہونا بھی ایک دوسرا بدیہی مسئلہ نظر آتا تھا کیونکہ انسانوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا تھا کہ زمین چل رہی ہے اور جب کوئی مضبوط عمارت بناتے تھے تو جانتے تھے کہ یہ صدہا سال قائم رہے گی اور اگر منہدم ہوگی تو بادوباراں وغیرہ کی وجہ سے نہ کہ زمین کی حرکت کے باعث۔

اگر کوئی شخص کسی مقام پر کوئی ٹیلہ یا پہاڑ دیکھتا ہے اور پچاس سال اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد پھر واپس آتا ہے تو وہ ٹیلہ یا پہاڑ کو اسی جگہ پاتا ہے اور اسے وہ وہاں سے ہٹا ہوا نظر نہیں آتا۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ زمین ساکت نہیں ہے بلکہ حرکت کررہی ہے اور وہ بھی دُہری حرکت تو یہی کہا جائے گا کہ اس کے دماغ میں خلل ہے یا شوخی اور مزاح کررہا ہے۔

نیکولاڈوکوزا چونکہ ایک محترم مذہبی عالم تھا اور اسے دیوانہ نہیں کہا جاسکتا تھا لہٰذا یہی کہا گیا کہ تمسخر اور شوخی کررہا ہے۔ اس کے رسالے کا عوام پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ عوام اس زمانے میں کتاب اور رسالہ پڑھتے ہی نہیں تھے اور خواص پر بھی یہ اثر ہوا کہ وہ سوچنے لگے کہ مصنف اس قدر بدیہی حقیقت کا انکار کرکے لوگوں سے مزاح کرنا چاہتا ہے۔

اس کے باوجود اگر وہ رسالہ نیکولاڈوکوزا کی زندگی میں وٹیکن پہنچ جاتا تو اس کے لئے ایک مشکل کھڑی کردیتا' یہاں تک کہ ہوسکتا تھا کہ اس کا ارغوانی رنگ کا مخصوص لباس اور کلاہ بھی چھن جاتی اور وہ کارڈینل کے بلند عہدے سے جو کیتھولک کلیسا کا دوسرا بڑا منصب تھا معزول ہوجاتا۔

مذکورہ بالا بیان کی بناء پر امام جعفر صادقؑ کا نظریہ نور جب صدیاں گزرنے کے بعد فلکی دوربین بنا سکنے اور اس کے ذریعے اجرام سماوی کا مطالعہ کرنے کا سبب بنا تو اس سے دور جدید میں علمی توسیع کو کافی مدد ملی۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں امام جعفر صادقؑ کے عہد میں صنعت کو دور حاضر کی طرح ترقی اور فروغ حاصل نہیں تھا لہٰذا آپ نے نور کا نظریہ تو بیان کردیا لیکن خود دوربین بنا کر اس سے اجرام فلکی کا مشاہدہ نہیں کرسکے۔ البتہ دوربین نہ بنا سکنے سے آپ کے نظریہ نور کی قدروقیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

آیا نیوٹن جس نے قوت جاذبہ کے قانون کا انکشاف کیا اس سیب کو جو اس کے سر پر گرا اور اس قانون کے انکشاف کا سبب بنا فضاء میں بھیجنے اور زمین کے گرد گردش دینے پر قادر ہوا؟

سبھی جانتے ہیں کہ جو راکٹ آج زمین کے گرد گردش کررہے ہیں یا چاند' مریخ اور زہرہ کی طرف جارہے ہیں۔ سب اسی قوت جاذبہ کے عمومی قانون کے پابند ہیں جسے نیوٹن نے منکشف کیا تھا' لیکن خود نیوٹن کیا آج کے انسانوں کی طرح اس سے عملی استفادہ کرسکا؟ پھر بھی نیوٹن کی یہ ناکامی کیا اس کے انکشاف کی وقعت و اہمیت میں ذرہ

برابر بھی کمی پیدا کرتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ نیوٹن چونکہ ایک راکٹ آسمان کی طرف نہیں بھیج سکا اور اسے زمین کے چاروں طرف گردش نہیں دے سکا لہٰذا اس کا انکشاف بے وقعت ہے؟ اگر کوئی شخص ایسی بات کہے تو صاحبان عقل کے نزدیک وہ خود حقیر ہوجائے گا کیونکہ یہ قول اس کی کم عقلی کی دلیل سمجھا جائے گا اگر نوع بشر آج بھی نیوٹن کے بتائے ہوئے اس قانون سے عملی فائدہ نہ اٹھا سکتی تب بھی اس کے اس عظیم علمی انکشاف کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی کیونکہ دنیا جانتی تھی اور جانتی ہے کہ نظام شمسی سے باہر بھی جو سورج اور کہکشاں ہیں وہ بھی اسی قانون کی پیروی کررہے ہیں اور اس ترتیب سے فضائی سفروں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ فضائی راکٹ اس نظام شمسی سے باہر بھی روانہ کئے جاسکیں گے۔ اور عملی تجربے سے معلوم ہوگا کہ اس عالم سے ماوراء بھی قوت جاذبہ کا قانون کائناتی حرکات کا ناظم ہے یا نہیں؟

گوکہ آج تک جو تجربات عمل میں آئے ہیں ان کے پیش نظر سمجھ میں آتا ہے کہ کائنات کے اندر کوئی استثناء موجود نہیں ہے اور جو قانون ایک حصے میں کارفرما ہے وہی دوسرے حصوں میں بھی کام کررہا ہے لیکن جب تک تجربے کی کسوٹی پر جانچ کے نہ دیکھ لیا جائے' قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہی قانون ہر جگہ نافذ ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے نظریہ نور میں دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ نور اشیاء کی طرف سے انسان کی آنکھ کی جانب آتا ہے۔ درحالیکہ اس سے قبل یہ کہا جاتا تھا کہ روشنی آنکھ سے اشیاء کی طرف جاتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس نظریئے کو رد کیا اور فرمایا کہ روشنی آنکھ سے اشیاء کی طرف نہیں بلکہ اشیاء سے آنکھ کی طرف آتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم تاریکی میں کوئی چیز نہیں دیکھ سکتے' درحالیکہ اگر نور آنکھ سے اشیاء کی طرف جاتا تو اندھیرے میں بھی ہر چیز نظر آتی۔

آپ نے فرمایا کہ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ چیز روشن ہو اگر وہ خود روشن نہیں ہے تو ضرورت ہے کہ اس پر کسی دوسری نورانی چیز کا نور پڑے اور اسے

روشن کرے تاکہ دیکھی جاسکے۔

روشنی کی سرعتِ رفتار کے بارے میں بھی آپؑ نے ایک نظریہ پیش فرمایا جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت جاذبِ توجہ ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ جو نور ہماری آنکھ کی طرف آتا ہے اس کی سرعت فوری ہے اور یہ حرکات کی قسموں میں سے ایک ہے۔ ہم ایک بار پھر اس نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ اس زمانے کے میکینکی وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ آپ سرعتِ نور کا کوئی پیمانہ قائم کرتے۔ لیکن یہ بیان فرما دیا کہ نور حرکت ہے اور اس کی سرعت فوری ہے اور تقریباً یہی نظریہ اس زمانے میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

آپؑ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز اپنے درس میں آپ نے فرمایا کہ "طاقتور نور وزنی اجسام کو حرکت میں لاسکتا ہے اور جو نور طورِ سینا پر حضرت موسیٰؑ کے سامنے ظاہر ہوا تھا وہ ایسے ہی انوار میں سے تھا کہ اگر خدا کی مشیّت ہو تو پہاڑ کو متحرک کردے۔ اس روایت کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالباً آپؑ نے اس طرح لیزر شعاعوں کی بنیادی تھیوری کی پیش گوئی فرمائی ہے۔

ہمارے خیال میں امام جعفر صادقؑ نے نور کی حرکت و سرعت اور اس کے بارے میں کہ روشنی اشیاء سے آنکھ کی طرف آتی ہے جو کچھ فرمایا ہے اس کی اہمیت بظاہر لیزر کی تھیوری سے زیادہ ہے کیونکہ یہ امام جعفر صادقؑ سے پہلے بھی بیان کی جاچکی ہے' لیکن نور کی حرکت و سرعت' اس کے ارتکاز اور اس کے اشیاء کی جانب سے آنکھ کی طرف آنے کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ آپؑ ہی کی ذات سے مخصوص ہے۔

قدیم زمانوں سے مختلف قوموں میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ نور اجسام کو حرکت میں لاسکتا ہے۔

قدیم مصر میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ نور ہر چیز سے گزر سکتا ہے اور اجسام کو متحرک کرسکتا ہے یہاں تک کہ پہاڑ بھی اس کو گزرنے سے نہیں روک سکتے ان کے اعتقاد میں معمولی روشنیاں پہاڑ سے گزرنے اور اسے متحرک کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں' لیکن

کی مانند چھایا رہا' اس کا گلا گھونٹتا رہا اور اسے سانس لینے کا موقع نہیں دیا۔ اگر یہ کابوس دُور نہ ہوتا اور علم آزادی کی فضا میں سانس نہ لے سکتا تو دورِ حاضر میں ہمیں کوئی علمی پیش رفت نصیب نہ ہوتی۔

مشرق کے اہلِ قلم اور دانشوروں میں بھی کچھ لوگ اسی نظریئے کے حامل ہیں جن میں سے ایک ہندوستان کے چاترجی ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اگر انسان زمین کی اپنے اور سورج کے اطراف میں حرکت کا پتا نہ لگاتا تو جہالت میں مبتلا رہتا اور دورِ جدید کی علمی کامیابیوں سے محروم رہ جاتا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ مسیحی کلیسا نے ارسطو اور بطلیموس کے اس نظریئے کی تائید کی تھی کہ زمین ساکت اور مرکزِ عالم ہے' اس کی نظر میں اگر زمین ساکت اور مرکزِ عالم نہ ہوتی تو خدا کا بیٹا (مسیح) اس میں ظہور نہ کرتا' اس لئے کہ خدا کا بیٹا اسی جگہ ظاہر ہوتا ہے جہاں مرکزِ عالم اور ثابت ہو۔ اور جو زمین ایسی نہ ہو تو وہ اس کی اہل نہیں۔ باوجود یہ کہ مسیحی کلیسا نے زمین کے ثبات اور اس کی مرکزیت کی تائید کی اور اسے عیسائی مذہب کا جزو بنالیا لیکن دانشور طبقہ ارسطو کے نظریئے کا سہارا لیتا تھا اور جب یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ زمین مرکزِ عالم اور ساکت ہے تو یہ نہیں کہتے تھے کہ مذہب بتاتا ہے بلکہ یہ کہتے تھے کہ ارسطو نے یہ کہا ہے۔

اگر کوپرنیک' کیپلر اور گیلیلیو' ارسطو کی غلطی کی اصلاح نہ کرتے اور اس کے اس نظریئے کو غلط ثابت نہ کرتے تو آج بھی اگر کوئی شخص کسی بات کو ثابت کرنا چاہتا اور ارسطو نے بھی اس سے متعلق اپنے نظریات کا اظہار کیا ہوتا تو یہی کہتا کہ ارسطو نے ایسا کہا ہے' کیونکہ اس کا قول حجت تھا اور کسی کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کے آثار و اقوال میں کوئی چیز ایسی بھی ہے جو درست نہیں ہے بالخصوص ثباتِ زمین اور اس کی مرکزیت کے بارے میں ارسطو کا نظریہ اسی دلیلِ مرکزیت کے ساتھ پہاڑ کے مانند غیر متزلزل نظر آتا تھا۔

انسان کی معنوی زندگی میں اور بھی غلط نظریات موجود تھے (حالانکہ ایسی صورت

میں انہیں علمی نظریہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ کسی نظریئے کے علمی ہونے کے لئے اس کی صحت ضروری ہے) اور شاید آج بھی موجود ہیں۔ لیکن کسی غلط نظریئے نے ارسطو کے اس نظریئے کی طرح علم، عقل و ادراک پر اپنا سایہ نہیں ڈالا، یہاں تک کہ انسانی عقل اور علمی ادراک اٹھارہ صدیوں تک محکوم بنا رہا۔اس طویل مدت میں جب مسیحی کلیسا بھی ارسطو کے نظریئے کو رسمی طور پر قبول کرتا تھا، کلیسا والوں میں صرف ایک شخص ایسا پیدا ہوا جس نے اس کی مخالفت کی اور وہ نیکولا ڈوکوزا ہے۔ جو کیتھولک کلیسا میں کارڈینال(CARDINAL) کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ یہ یونان کے قدیم حکماء کی کتابیں پڑھنے کا شائق تھا۔

ویٹیکن کا کتب خانہ علمی اور ادبی لحاظ سے یورپ اور امریکہ والوں پر بڑا حق رکھتا ہے، کیونکہ یونان اور قدیم روم کے معارف و معلومات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کے ذریعے یورپ اور امریکہ تک پہنچا۔ یورپ میں چند دوسرے کتب خانے بھی تھے جنہوں نے ان علوم کو منتقل کرنے میں حصہ لے کر اہلِ یورپ پر احسان کیا ہے۔ البتہ ان میں سے کوئی کتب خانہ ویٹیکن سے زیادہ اپنا حق نہیں رکھتا۔ کیونکہ اگر یہ کتب خانہ نہ ہوتا تو یونان اور قدیم روم کے بہت سے معارف مخفی رہ جاتے۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یورپ ہمیشہ میدانِ جنگ بنا رہا اور جو لوگ جنگ میں مصروف تھے وہ کتاب کی اہمیت کے قائل نہیں تھے۔ وہ کتابوں کو جلا دیتے تھے یا ویران کھنڈروں میں دفن کروایا کرتے تھے۔ البتہ جو کتابیں ویٹیکن میں تھیں وہ چند دیگر مذہبی مراکز کی کتابوں کی طرح دو وجوہات سے باقی اور محفوظ رہ جاتی تھیں۔ اوّل یہ کہ جنگجو افراد چونکہ عیسائی تھے اور ان مراکز کو مقدّس مانتے تھے لہٰذا ان پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ دوسری یہ کہ ان مراکز میں رہنے والے علم دوست تھے اور کتابوں کی قدر جانتے تھے، ان کی حفاظت کرتے تھے اور گرد و غبار یا حشرات الارض کے ہاتھوں انہیں برباد نہیں ہونے دیتے تھے۔

یورپ کی قدیم درس گاہیں، جیسے اٹلی کی "پاڈو" انگلستان کی "آکسفورڈ" اور فرانس

کی "ساربون" یونان اور قدیم روم کی علمی و ادبی میراث کی حفاظت کے لحاظ سے صفِ اول میں شمار نہیں کی جاتیں تھیں کیونکہ یہ تمام درس گاہیں دس عیسوی صدیاں گزرجانے کے بعد وجود میں آئیں اور انہوں نے ویٹیکن اور یورپ کے دیگر مذہبی مراکز کے کتابی خزانوں سے استفادہ کیا۔ پہلی دس صدیوں میں صرف ویٹیکن اور دوسرے مذہبی مراکز ہی کتابوں کے محافظ تھے۔

یورپ کے امراء اور سلاطین جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ سبھی اَن پڑھ تھے۔ کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ بعض ادوار میں تو بادشاہوں اور امراء و اشراف کے لئے پڑھنا لکھنا ایک بڑا عیب اور باعثِ ننگ و عار تھا۔ جب بادشاہ اور امراء ان پڑھ ہوں تو ظاہر ہے کہ عام آدمی کی تعلیمی حالت کیسی ہوگی؟

یورپ میں تعلیمی مراکز اور کتاب پڑھنے یا محفوظ رکھنے کے مقامات صرف دینی مراکز تھے۔ اور اگر یہ مراکز یونانی، لاطینی اور سریانی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کی حفاظت نہ کرتے تو یونان اور قدیم روم کے علوم موجودہ یورپی اقوام تک نہ پہنچتے۔

ویٹیکن کا کتب خانہ یونانی، قدیم یونانی اور لاطینی کتابوں کا مالک ہونے کی وجہ سے دیگر مذہبی مراکز کے کتب خانوں کے مقابلے میں زیادہ مستغنی تھا۔ البتہ معمولی علماء کا وہاں گزر نہ تھا صرف اسقف اور کارڈینل جو کلیسا کے امراء کہے جاتے تھے اس میں داخل ہوسکتے اور کتابوں سے استفادہ کرسکتے تھے۔

آج اس کتب خانے میں ہر عیسائی عالم آزادی سے جاسکتا ہے چاہے وہ ابتدائی درجے کا پادری ہو۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ گزشتہ دور میں کیتھولک کلیسا کے اندر بھی علمی حیثیت سے امتیاز برتا جاتا تھا اور جو پادری نچلے درجے کے ہوتے تھے انہیں ویٹیکن کے کتب خانے میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

انہیں اجازت نہ دینے کا ظاہری سبب تو یہ تھا کہ ان کے قول کے مطابق جو پادری نچلے درجے کے ہیں ان کے پاس اتنا علم ہی نہیں ہے کہ ویٹیکن کی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں، لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ کلیسا کے امراء اور چھوٹے پادریوں کے درمیان حد

فاصل قائم کی جائے، کیونکہ امراء یہ نہیں چاہتے تھے کہ چھوٹے پادری کتب خانے کے اندر ان کے پہلو میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کریں۔ اس کتب خانے کی کتابیں کسی شخص کو عاریتاً" نہیں دی جاتی تھیں کہ وہ اپنے گھر لے جاکر اطمینان سے مطالعہ کرسکے اور ان کتابوں کے غائب نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہیں باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ آج بھی انہیں کسی کو عاریتاً نہیں دیا جاتا، صرف ان کی کاپی کو باہر بھیجا جاتا ہے۔

نیکولا ڈوکوزا چونکہ امراءِ کلیسا میں سے تھا لہٰذا کتب خانے کے اندر جاکر اس کی قدیم کتابوں سے استفادہ کرسکتا تھا۔ یہ قدیم یونانی زبان بھی جانتا تھا لہٰذا اس نے زمین کی وضعی اور انتقالی حرکات کے بارے میں ارسٹارخوس جیسے قدیم یونانی حکماء کے نظریئے سے آگاہی حاصل کی، اس کے بعد ویٹیکن سے اپنے روحانی مرکز جرمنی پلٹ آیا۔

اس نے جرمنی میں زمین کی حرکتِ وضعی و انتقالی کی تشریح لکھی جو ایک رسالے کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس دور میں طباعت کی صنعت اس قدر عام نہیں تھی کہ نیکولا ڈوکوزا اسے چھپوالیتا لہٰذا اس کی اشاعت پرانے طریقے پر ہوئی اور جو شخص اس رسالے کا شائق ہوتا تھا وہ اس کی نقل کرلیتا تھا۔

نیکولا ڈوکوزا نے یہ رسالہ ۱۴۶۰ء میں (کوپرنیک کی ولادت سے ۱۳ سال قبل) شائع کیا اور اس میں کہا کہ زمین ساکت نہیں ہے بلکہ اپنے گرد اور سورج کے گرد گھومتی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ گردشِ زمین کا اعلان اس کے نام سے نہ ہوا بلکہ کوپرنیک لہستانی کے نام سے ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نیکولاڈوکوزا ایک مذہبی عالم تھا اور علمِ نجوم و ریاضی سے نابلد تھا جب کہ کوپرنیک ایک منجم اور ریاضی داں تھا اور اس نے زمین کی حرکت کو علمی طور پر ثابت کیا تھا۔

نیکولاڈوکوزا نے قدیم حکمائے یونان کا جو نظریہ معلوم کیا تھا اسے بغیر علمی استدلال کے دہرایا۔ چونکہ اس کا رسالہ دلیل سے عاری تھا لہٰذا یہ روحانی مرکز سے باہر اثر انداز

خلفائے فاطمی نے جن کی مدتِ خلافت (۲۶۷) دو سو سڑسٹھ سال تھی، امام جعفر صادقؑ کے مذہبی ادارے سے توانائی حاصل کی۔ پہلا فاطمی خلیفہ عبیداللہ تھا جو شام میں وہاں کے شیعوں کا پیشوا شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے تیسری صدی ہجری کے نیمۂ آخر میں عباسی خلفاء کے مقابل اپنی خلافت کا اعلان کیا اور لیبیا کو افریقہ میں شامل کرکے اسے مرکزِ خلافت بنانے میں کامیاب ہوا۔

بعض لوگوں نے خیال کیا ہے کہ فاطمیوں کی خلافت ایک مقامی حکومت تھی درحالیکہ ان شیعہ فاطمیوں نے ایک بڑی سلطنت قائم کرلی تھی اور عبیداللہ کے جانشینوں نے بتدریج جنوبی اٹلی کے جزیرہ سسلی، مغربی عربستان کے ایک حصے فلسطین، شام اور مصر پر تصرف حاصل کرکے شہر قاہرہ کو اپنا دارالخلافہ بنالیا تھا۔ البتہ فاطمیوں نے ایک بدعت ایجاد کی اور ان کا چھٹا خلیفہ الحکیم چوتھی صدی ہجری کے نیمۂ آخر میں سختی سے عرفان میں مشغول ہوگیا لیکن امام جعفر صادق کے عرفان کے طرز پر نہیں، جس کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ مبالغے سے دور تھا، بلکہ اس عرفان پر جو وحدتِ وجود کا عقیدہ رکھتا تھا۔

وحدتِ وجود کے عرفانی عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مکتب کے پیرو عرفاء کا قول تھا کہ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی نے خدا کو پیدا کیا ہو، پھر وہ بھی کسی دوسرے کا مخلوق قرار پائے گا اور یہ تسلسل کبھی ختم نہ ہوگا کیونکہ جو پیدا کرنے والا کسی چیز کو خلق کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہو۔ لہٰذا خدا شناسی کی منزل میں یہ عظیم مشکل صرف ایک ہی ذریعے سے دور ہوسکتی ہے اور وہ ہے وحدتِ خالق و مخلوق کا عقیدہ۔ اس لئے کہ جب ہم یہ طے کرلیں گے کہ خدا اور اس کی دیگر مخلوقات جن میں انسان بھی ہے، ایک ہی ہیں تو پھر یہ سوال پیش نہیں آئے گا کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔

چھٹے فاطمی خلیفہ نے عرفانی خیالات میں غلو کی وجہ سے ایک بار یہ سوچنا شروع کیا کہ اپنے کو خدا کہے اور لوگوں کو بتائے کہ وہ خدا ہے۔ اس سلسلے میں ایک کہانی بھی

مشہور ہے جسے بعض لوگوں نے فراعنہ مصر کی طرف منسوب کیا ہے درحالیکہ یہ الحکیم سے متعلق ہے اور اس کی اجمالی روداد یہ ہے کہ جب الحکیم نے خدائی کا دعویٰ کرنا چاہا تو اس کے وزیر نے اسے روکا اور کہا کہ لوگ آپ کی خدائی تسلیم نہیں کریں گے۔ لیکن اس نے کہا کہ وہ خود کو خدا سمجھتا ہے۔ اور لوگوں کو بھی اسے خدا ماننا چاہیے۔

وزیر نے کہا' تو پھر آپ حکم دیجئے کہ آپ کی مملکت میں تمام کاشتکار گیہوں کے بجائے باقلا بوئیں تاکہ سب کی اصلی غذا یہی باقلا بن جائے۔ چنانچہ الحکیم نے قطعی حکم نافذ کردیا کہ اب گندم نہیں بلکہ باقلا بویا جائے۔

سات سال گزرنے کے بعد ایک روز وزیر کسی راستے سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک دراز قد اور کوتاہ قد آدمی آپس میں سخت جھگڑا کررہے ہیں۔ وزیر قریب گیا اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرکے وجہ نزاع دریافت کی۔ کوتاہ قد نے کہا کہ بات یہ ہے کہ اس نے میرے لڑکے کو قتل کیا ہے۔

وزیر نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کے لڑکے کو قتل کیا ہے؟ اس شخص نے ایک نعل اپنی جیب سے نکالی اور کہا کہ میں نے اسے ایک گلی میں پایا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ ایک گھوڑا خریدوں اور یہ نعل اس کے سم میں لگوادوں۔ اس کے بعد اس کی لگام اس دروازے کی کنڈی میں باندھ دوں۔

کوتاہ قد نے کہا یہ دروازہ میرا ہے' اس جگہ میرا گھر بنے گا' پھر میرا ارادہ ہے کہ میں شادی کروں گا' اس کے بعد میرے یہاں لڑکا پیدا ہوگا اور جب وہ لڑکا گلی میں کھیلنے کے لئے گھر سے باہر نکلے گا تو دروازے میں اس شخص کا گھوڑا بندھا ہوگا جو لات مار کر میرے لڑکے کو مار ڈالے گا۔ یہ کہہ کر اس نے پھر دراز قد پر حملہ کردیا۔

وزیر ان دونوں کو انہی کے حال پر چھوڑ کر الحکیم کے پاس پہنچا اور کہا کہ اب آپ خدائی کا دعویٰ کرسکتے ہیں کیونکہ سات سال تک صرف باقلا کھانے کی وجہ سے لوگوں کی عقل زائل ہوچکی ہے۔ ان چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روایت محض ایک افسانہ ہے۔ ان میں سے ایک' عقل پر باقلا کی منفی تاثیر بھی ہے۔ جو صحیح نہیں ہے کیونکہ باقلا

کا زیادہ استعمال مزاجی اعتبار سے تو مضر ہوسکتا ہے لیکن عقل کو زائل نہیں کرتا۔

الحکیم خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور اگر کوئی شخص اس سے دلیل مانگتا تھا تو کہتا تھا کہ خدا اور کائنات اور خالق و مخلوق سب ایک ہیں اور چونکہ خالق کے ساتھ وحدت رکھتا ہوں لہٰذا خدا ہوں اور تمہیں میری پرستش کرنا چاہیے۔

کہا جاتا ہے کہ صلاح الدین ایوبی نے فاطمی خلیفہ کو اس کے خدائی کے دعویٰ کی وجہ سے قتل کرنے کے لئے مصر پر فوج کشی کی اور قاہرہ پر قابض ہوگیا' لیکن جس زمانے میں الحکیم نے خدائی کا دعویٰ کیا اور جس وقت صلاح الدین مصر میں وارد ہوا دونوں کے درمیان ایک سو اکیاون سال کا فاصلہ ہے۔ لہٰذا اس طرح صلاح الدین ایوبی گویا الحکیم کے دعویٰ ربوبیت کے ایک سو اکیاون سال بعد مصر پہنچا۔ البتہ تحقیق یہی ظاہر کرتی ہے کہ فاطمی خلافت کا اقتدار صلاح الدین ایوبی ہی کے ہاتھوں ختم ہوا۔

الحکیم خدا کا دعویٰ کرنے میں کئی مرحلوں سے گزرا۔ وہ پہلے مرحلے پر وہی بات کہتا تھا جو اس کے ہم مسلک عرفاء کا قول تھا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ خالق و مخلوق ایک ہیں اور اس منزل سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا نے اس کے اندر حلول کیا ہے اور یہ بقول اس کے کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ خدا تمام موجودات میں ہے لہٰذا اس کے اندر بھی موجود ہے۔

الحکیم نے بھی آج کل کے شہرت طلب لوگوں کی طرح جو خود کو مشہور کرنے کے لئے پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو مامور کیا تھا کہ مصر' شام' فلسطین اور ان دیگر ممالک میں جو فاطمی سلطنت کے زیر نگین ہیں اس چیز کی تبلیغ کریں کہ خدا نے خلیفہ کے اندر حلول کیا ہے۔

یہ تبلیغ اس زمانے میں کی گئی جب چوتھی صدی ہجری کا نیمۂ آخر تھا اور اس وقت مسالکِ تصوّف و عرفان کے مشائخ و اقطاب سے عقیدت اسلامی ممالک میں ہر دور سے زیادہ تھی۔ چوتھی صدی ہجری ان ممالک میں علمی ترقی کی صدی تھی۔ لیکن علمی پیشقدمی کے مقابل تصوّف و عرفان کے اقطاب و مشائخ سے عقیدت مندی میں بھی

وسعت پیدا ہوگئی تھی اور باخبر لوگوں کا ایک گروہ بھی تصوّف اور عرفان کے فرقوں سے وابستہ ہو رہا تھا۔

اس دور کا تقاضہ یہ تھا کہ ہر شخص کسی عرفان یا تصوّف کے فرقے سے منسلک رہے تاکہ اپنے زمانے والوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ لوگوں کا تصور تھا کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی فرقے کا رکن نہیں ہے تو وہ رفتارِ زمانہ کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

اس دور کے تقاضوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جو شخص کسی عرفانی یا تصوّف کے فرقے کی رہبری کا مدعی ہو اسے صاحبِ کرامت ہونا چاہئے اور اپنے پیروؤں کے سامنے خارقِ عادت کام کرنا چاہئیں۔ یہ کرامات' تاریخ کی صورت میں نقل ہوتی تھیں اور ہمیشہ گزشتہ زمانے میں ان کا اتفاق ہوا ہوتا تھا' کوئی شخص یہ نہیں کہتا تھا کہ میں نے ایک پیر یا قطب سے یہ کرامت دیکھی ہے بلکہ یہ کہتا تھا کہ گزشتہ زمانے میں ایسا ہوا ہے۔

البتہ چونکہ اکثر اقطاب و مشائخ پرہیزگار قسم کے لوگ ہوتے تھے لہٰذا جب ان کے مرید اور پیرو یہ سنتے تھے کہ ان سے خارقِ عادت باتیں ظاہر ہوئی ہیں تو خود سے دیکھے بغیر بھی تسلیم کر لیتے تھے۔

ایسے ہی ایک دور میں جب مختلف فرقوں کے مرشدوں سے خوارق اور کرامات کا ظہور ایک عام چیز تھی اس وقت لوگوں نے سنا کہ خدا نے ان کے خلیفہ میں حلول کیا ہے' تو زیادہ حیرت زدہ نہیں ہوئے۔ اس کے بعد خلیفہ ربوبیت کے آخری مرحلے میں داخل ہوگیا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ خدا ہے اور لوگوں کو اس کی پرستش کرنا چاہئے۔

پہلے اور دوسرے مرحلے میں الحکیم جو کچھ کہہ رہا تھا وہ تو وحدتِ وجود کی بنیاد پر عارفانِ زمانہ کے نظریات کے مطابق تھا' لیکن جب اس نے دعویٰ کیا کہ وہ خدا ہے اور لوگوں کو اس کی پرستش کرنا چاہئے تو یہاں سے حیرت و تعجب کا آغاز ہوا اور نکتہ چینوں کی زبانیں کھل گئیں۔

ہم جانتے ہیں کہ الحکیم اور دوسرے فاطمی خلفاء شیعہ تھے اور شیعوں کا یہ عقیدہ

اگر طاقتور روشنی وجود میں آجائے تو ایسا کر سکتی ہے اور یہ اس کی رفتار پر منحصر ہے کہ پہاڑ کے درمیان سے گزر کر اسے جنبش میں لے آئے۔

اس نظریئے کے طبیعیاتی سبب کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن تمام قدیم اقوام کے درمیان یہ عقیدہ موجود تھا۔ اسی طرح ان مذاہب کے وجود میں آنے سے قبل جن کی تاریخ ہمارے پاس ہے۔ یہ عقیدہ رائج تھا کیونکہ ان ادیان اور مذاہب سے قبل لوگ جادوگری پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک دین اور جادوگری کے درمیان کوئی فرق نہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ نور حجابات سے گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اجسام کو حرکت میں لا سکتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کی جادوگری ہے۔

اس عقیدے کی بنیاد اور آغاز سے ہم واقف نہیں ہیں اور جن لوگوں نے اس سلسلے میں کچھ کہا ہے وہ محض قیاس ہے ورنہ کوئی ایسا ماخذ موجود نہیں ہے جس سے پتہ چلے کہ یہ ابتداء میں کس قوم میں پیدا ہوا۔

اگر ہم نور کے انرجی ہونے کے عقیدے سے ہٹ کر دیکھیں تو امام جعفر صادقؑ کے نظریئے میں سرعتِ نور کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ وہی چیز ہے جسے لوگ آج جانتے ہیں اور روشنی کی تیز رفتاری کا حساب ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر لگایا گیا ہے۔ یہ سرعت آج سرعت شمار نہیں ہوتی کیونکہ جدید علمی پیمانوں کے لحاظ سے ایک سیکنڈ بھی طولانی مدت ہے اور نجومی مسافتوں کے لحاظ سے تین لاکھ کلومیٹر ایک مختصر فاصلہ ہے۔

البتہ قدیم پیمانوں کو سامنے رکھنے کے بعد ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کی رفتار سرعت شمار ہوتی تھی۔ روشنی کی سرعتِ رفتار کا پتا لگانے میں بھی امام جعفر صادقؑ کو اوّلیت حاصل ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کی ثقافت اور علمی تحقیق کی عمارت چار ستونوں پر قائم تھی۔

اس ثقافت کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ بلاوجہ اور سخت قسم کے

تعصّب سے پاک ہے اور اس میں مذہبی ادارے کا ایک بنیادی عامل یہ بھی ہے کہ آپ
نے اس قسم کے تعصّب سے علیحدگی اختیار کی اور شیعہ مذہب کے پیروکاروں کے
ہاتھوں میں کوئی ایسا بہانہ یا دستاویز نہیں دی جسے ایسے متعصّبانہ رویئے کی سند بنا کر وہ
آپس میں تفرقہ پیدا کریں اور اس مذہب میں طرح طرح کے فرقے پیدا ہوں۔

امام جعفر صادقؑ جب پیغمبرِ اسلامؐ یا اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی کی تعریف کرتے
تھے تو انہیں ایک عام انسان کی صورت میں پیش کرتے تھے نہ انہیں خدائی کی منزل تک
پہنچاتے تھے اور نہ مافوق بشر مخلوقات میں شمار کرتے تھے تاکہ یہ خیال نہ پیدا ہو کہ ان کا
وجود آدمی اور خدا کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔ اگر آپ ایسا کہتے تو شیعوں میں
اختلاف پیدا ہو جاتا اور یہ بحث اٹھ کھڑی ہوتی کہ خدا اور انسان کے درمیان حدِ فاصل
کس قدر ہے؟ اگر یہ فاصلہ ایک سو اسی درجے پر فرض کیا جائے اور خدا ایک سو اسی
درجے پر اور نوعِ بشر پہلے درجے پر ہو تو آیا پیغمبرِ اسلامؐ ہم سے نوے درجے کے فاصلے پر
ہیں یا سو درجے پر یا ایک سو پچاس درجے پر اور اس طرح آپؐ خدا سے تیس درجے
سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں لیکن نوعِ بشر سے ایک سو پچاس درجے دور ہیں؟

شاید یہ کہا جائے کہ جس وقت امام جعفر صادقؑ یہ کہتے کہ پیغمبرِ اسلامؐ اور آپؐ کے
اجداد' خدا اور عام انسان کے درمیان فرق اور فاصلہ قائم کرتے ہیں تو یہ بحث پیدا نہ
ہوتی کہ وہ خدا سے زیادہ قریب ہیں یا انسان سے لیکن بعض مذاہب کے اندر گزشتہ
زمانے میں یہ بحث رونما ہو چکی ہے۔

باوجود یہ کہ امام جعفر صادقؑ نے پیغمبرِ اسلامؐ' اپنے آباؤ اجداد اور خود کو عام افراد
کے بطور پیش کیا' یہ ہرگز نہیں کہا کہ یہ ہستیاں الوہیت کا پہلو رکھتی ہیں۔ کبھی یہ بات
زبان پر نہیں لائے کہ یہ جسمانی خلقت کے لحاظ سے مافوقِ بشر ہیں اور ان کے باطن و
روحانی فضائل و کمالات کے بارے میں قطعاً غلو نہیں کیا۔ پھر بھی آپ کے بعد تیسری
صدی سے شیعوں میں کئی فرقے پیدا ہوئے اور یہ عرفانی فرقے تھے لیکن اس طرح
تعصّب کا مظاہرہ کرتے تھے جیسے ان میں سے ہر ایک فرقہ ایک جداگانہ مذہب کا حامل

ہو۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جعفری مذہب کی ثقافت کے چار ارکان میں سے ایک عرفان
بھی تھا۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان اعتدال کا پہلو رکھتا تھا اور آپؑ
عرفان کو صرف مذہبِ شیعہ کی بخوبی شناخت کے لئے کار آمد سمجھتے ہیں۔ نہ یہ کہ اس حد
سے تجاوز کر کے خود ایک مذہب کی صورت اختیار کر لے۔

البتہ شیعوں کے جو عرفانی فرقے تیسری صدی کے بعد وجود میں آئے انہوں نے غلو
سے کام لیا اور ان میں سے بعض وحدتِ خالق و مخلوق کے قائل ہو گئے جب کہ امام
جعفر صادقؑ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔

بعض نے اس طرح بھی غلو کیا کہ وحدتِ خالق و مخلوق میں انسان کو خالق سے برتر
تصور کیا جو اصولِ مذہبِ شیعہ کے لحاظ سے کفر ہے۔

لیکن ان تمام عرفانی فرقوں نے آپؑ کے مذہبی ادارے کی آزادی سے فائدہ اٹھایا'
جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس میں کسی شخص کو اس جرم میں لائقِ ملامت و سزا قرار
نہیں دیا جاتا تھا کہ اس نے کوئی نظریہ پیش کیا ہے۔ البتہ اپنے زمانہ حیات میں خود امام
جعفر صادقؑ اور آپ کے بعد آپ کے شاگرد مخالفوں کے اقوال کو رد کرتے رہتے تھے
جس طرح ابن راوندی کے قول کو رد کیا ہے۔

ان تمام عرفانی فرقوں میں جو امام جعفر صادقؑ کے بعد پیدا ہوئے خالق و مخلوق کی
وحدت نظر آتی ہے ان کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ وحدتِ خالق و مخلوق بعض
فرقوں میں بلاواسطہ ہے اور بعض میں بالواسطہ ان میں سے بعض کے نزدیک ہر آدمی خدا
کے ساتھ متحد ہے اور بالقوت خالق و مخلوق کی قدرت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن دوسرے فرقوں میں معمولی افراد کو خدا کے ساتھ وحدت حاصل نہیں ہے۔
بلکہ پیغمبرِ اسلامؐ اور ائمہ معصومینؑ خدا کے ساتھ ایک وجودِ واحد کی تشکیل کرتے ہیں۔

ایسے فرقے بھی وجود میں آئے جن میں فرقے کا رہبر جسے پیر یا قطب یا مرشد یا
غوث کہتے ہیں' خدا کے ساتھ وحدتِ وجود رکھتا ہے۔

(مضمون نگار کے خیال میں جنہوں نے ہر فرقے کو شیعہ سمجھ لیا ہے) ان فرقوں

ہوا کہ گھاس کی دکان اور سرمایہ تجارت کے علاوہ شہر کے اندر ایک مکان اور شہر سے باہر ایک باغ ہے۔ اس نے کہا کہ میں مردے کو تو زندہ کرسکتا ہوں لیکن اس کا بیٹا اس پر راضی نہ ہوگا اس لئے کہ اگر اس کا باپ زندہ ہوگیا تو جس میراث کو یہ تین سال سے اپنی جائیداد سمجھ رہا ہے اور اس پر مالکانہ تصرف کررہا ہے اسے واپس کرنا پڑے گا جب متوفی کے بیٹے نے یہ سنا کہ خلیفہ سے اس کے باپ کو پھر سے زندہ کرنے کی درخواست کی گئی ہے تو اتنا گھبرایا کہ فوراً قرض خواہوں سے سمجھوتہ کرلیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ خلیفہ اس کے باپ کو زندہ کردے اور جس میراث پر وہ تین سال سے قابض ہے ہاتھ سے نکل جائے۔

لیکن جو لوگ خلیفہ کی قدرت نمائی کے خواہاں تھے۔ وہ خاموش نہیں ہوئے اور چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا مردہ زندہ کردیا جائے۔ جب الحکیم نے اپنے کو شکنجے میں دیکھا تو مسلمانوں کی کتابِ خدا یعنی قرآن مجید کی آیت کی غلط تفسیر کا سہارا لیا۔ اس آسمانی کتاب میں کہا گیا ہے کہ خدا زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے چنانچہ خدا اپنے اس قول اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ہمیشہ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے خارج کرسکتا ہے۔ لیکن الحکیم نے کہا کہ میں اس خدائی قول کے مطابق کہ خدا کبھی تو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے تمہیں مطمئن کرنے کے لئے مردہ کو زندہ سے نکالتا ہوں۔ معترضین نے کہا کہ یہ کام تو قصاب بھی روزانہ کرتے رہتے ہیں اور مردہ گوسفندوں کو زندہ سے الگ کرتے ہیں۔ اگر خلیفہ واقعی خدا ہے تو اسے کسی انسان یا کم از کم کسی حیوان کو مرنے کے بعد زندہ کرنا چاہئے۔ خلیفہ نے کہا یہ کام اپنے وقت پر انجام پائے گا اور اس وقت کا تعین بھی خدا ہی کرسکتا ہے۔

البتہ چونکہ اعتراض کرنے والے کسی طرح باز نہیں آتے تھے اور برابر کہتے رہتے تھے کہ خلیفہ کم از کم ایک ہی کام ایسا کرکے دکھائے جس سے اس کی خدائی ثابت ہو' لہٰذا الحکیم نے اپنے کو اس مستقل پریشانی سے بچانے کے لئے پہلی بار شیعی ثقافت میں یہ بدعت ایجاد کی کہ مذہبی مسائل میں آزادانہ بحث کی ممانعت کردی۔ ہم پہلے ہی بتا

چکے ہیں کہ اس مکتب میں شیعی ثقافت کا بنیادی رکن اور اس کی تقویت کا سبب ہر طرح کی مذہبی بحث کی آزادی تھا' یہاں تک کہ امام جعفر صادقؑ آپ کے بعد آپ کے شاگرد اور ان کے بعد دوسری اور تیسری نسل کے شاگرد بھی اعتراض کرنے والوں کے جوابات دیا کرتے تھے اور تمام شیعہ علاقوں میں کوئی شخص ایک صاحبِ فکر و نظر کو اس بنیاد پر نہیں ستاتا تھا کہ اس نے کسی مذہبی مسئلے کے سلسلے میں کوئی نیا نظریہ پیش کیا ہے۔

الحکیم نے اس آزادی کو محدود کیا اور اپنی اس حد بندی کو شرعی حیثیت دینے کے لئے کہا کہ جو شخص خدا کا منکر ہے اور خدا کے کاموں پر کوئی اعتراض کرتا ہے وہ مرتد ہے اور اس کا قتل واجب ہے لہٰذا خدا کی صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کے بارے میں ہر طرح کی بحث ممنوع ہے۔

یہ وہ پہلا قدم تھا جو الحکیم نے امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت میں آزادی کو محدود کرنے کے لئے اٹھایا چنانچہ اس کے بعد پھر کسی نے خدائی کا دعویٰ کرنے والے شخص کی صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ میں بحث کی جرات نہیں کی۔ الحکیم کا یہ قدغن صرف انہی مسائل کے لئے تھا جو خدا کی صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ سے متعلق تھے' لہٰذا جو شیعہ اس کی حکومت میں زندگی بسر کررہے تھے وہ مجاز نہیں تھے کہ توحید کے بارے میں کوئی بحث کریں یا ایسی گفتگو کے بارے میں جو اس کی اور اس کے دعوے کی تائید کرتی ہو۔

البتہ شیعہ مذہب سے متعلق دیگر مسائل میں بحث کرنے کے لئے لوگ آزاد تھے اور خلیفہ اس سلسلے میں انہیں کوئی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ جن لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ حسن صباح نے الحکیم سے اثر قبول کیا تھا' انہیں غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ جب الحکیم نے خدائی کا دعویٰ کیا اور جب حسن صباح تعلیم کے لئے مصر گیا' ان دونوں کے درمیان اسّی (۸۰) سال کا فاصلہ ہے الحکیم نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں دعویٰ کیا اور حسن صباح پانچویں صدی کے نیمہ آخر میں حصولِ علم کے لئے مصر گیا۔ اس نے الموت میں منتقل ہونے کے بعد خدائی کا دعویٰ نہیں کیا اور ابتدائی برسوں میں مستقل

طور پر اپنے پیروؤں کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا' دوسرے یہ کہ تعلیم کے لئے مصر جانے کے بعد اس نے ایران کی قدیم تاریخ سے آگاہی حاصل کی۔

ممکن ہے اس کو قدیم ایران کی تاریخ کا علم اسکندریہ کے پرانے کتب خانے سے حاصل ہوا ہو وہ مکتب بھی جیسا کہ محتاجِ تفصیل نہیں ہے قدیم یونان کے علوم اور ادب سے استفادہ کرتا تھا اور اسی وجہ سے الموت میں مقیم ہونے کے بعد حسن صباح نے جو قدم اٹھایا وہ فقط ایک مذہبی اقدام نہیں تھا بلکہ قومی پہلو بھی رکھتا تھا ایسی صورت میں فاطمی خلیفہ الحکیم کے دعوئے خدائی اور بعد میں حسن صباح کے اقدام——— کے درمیان بہت فرق پایا جاتا ہے اور یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ حسن صباح نے الحکیم سے اثر قبول کیا تھا۔

لوند یونیورسٹی میں——— تاریخِ مذاہب کے استاد سویڈن کے پروفیسر بریم نے کہا ہے کہ الموت کے اسماعیلی ایران کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتے تھے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی پیش قدمی میں قومی مسئلہ بھی موثر تھا۔

ایک مدت تو معترضین کی زبان بند رکھی گئی لیکن جب خلیفہ کی سخت گیری میں کمزوری آئی تو ان لوگوں نے پھر آواز بلند کرنا شروع کی اور کہا کہ ہم نے خدا کی صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا ہے لیکن یہ صفتیں خلیفہ پر منطبق نہیں ہوتیں اور ہمارا اعتراض اسی سلسلے میں ہے نہ کہ توحید کے بارے میں' کیونکہ اسلام میں اس پر کسی مسلمان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

خلیفہ نے محسوس کیا کہ یہ اعتراض دیگر بڑے اعتراضات کا پیش خیمہ ہے لہٰذا اس نے یہ حکمِ امتناعی جاری کردیا کہ جو شخص خلیفہ پر صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ کے انطباق سے متعلق کوئی اعتراض کرے گا وہ مرتد اور واجب القتل ہے چنانچہ دوبارہ جو زبانیں حرکت میں آرہی تھیں خاموش ہوگئیں۔

یہاں تک کہ جب خلیفہ میں اضمحلال پیدا ہوا اور اعتراضات پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو جو لوگ اعتراض کرنا چاہتے تھے اور جان کے خوف سے زبان کھول نہیں

سکتے تھے انہوں نے کہا کہ خلیفہ اگر خدا ہے تو اسے صاحبِ اولاد نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آسمانی کتاب میں اسکی صراحت ہوچکی ہے کہ نہ خدا کسی سے پیدا ہوا ہے نہ اس سے کوئی متولد ہوتا ہے لیکن خلیفہ کے کئی بیٹے تھے اور وہ ان سے انکار بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ محبتِ پدری اسے روک رہی تھی اور کیونکہ وہ خدائی کے دعوے سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا اور اپنے بیٹوں کا انکار بھی نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اس نے کہا کہ اگر خدا فرزند رکھتا ہے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ آیا مسیحؑ خدا کے بیٹے نہیں تھے؟ اور کیا حدیث میں نہیں آیا ہے کہ تمام بندے خدا کے فرزند ہیں؟

مسیح کے بارے میں الحکیم جو بات کہہ رہا تھا اس سے وہ مسیحیوں کے عقائد کا ایک حصہ شیعوں کے مسلک میں داخل کررہا تھا' کیونکہ وہ لوگ باوجودیکہ مسیحؑ کو پیغمبر اور خدا کا فرستادہ مانتے تھے لیکن یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں بلکہ شیعیت کے دائرے سے باہر بھی کوئی مسلمان اس چیز کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ خدا کا بیٹا بھی ہوسکتا ہے۔

خلیفہ نے محض اس مقصد سے کہ صاحبِ اولاد ہونا اس کے دعوئے خدائی میں مخل نہ ہو کہہ دیا کہ خدا کے بیٹے ہوسکتے ہیں اور چونکہ بقول اس کے خدا کے لئے صاحبِ اولاد ہونا جائز ہے لہٰذا اس کے بعد اس کے بیٹے بھی خدا ہوسکتے ہیں۔

اس طرح اقتدار کی محبت اور جذبۂ برتری کے باعث الحکیم نے اپنی خلافت میں مکتبِ جعفری کو بظاہر ایک بڑا دھچکا پہنچایا اور اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ یہ ظاہری دھچکا واقعی اور باطنی پہلو نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ کوئی بھی بافہم شیعہ خلیفہ کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ البتہ سب جان یا روزی' روٹی یا دونوں کو بچانے کے لئے چپ رہنے پر مجبور تھے۔

الحکیم محسوس کرتا تھا کہ بافہم و سمجھدار طبقے نے اگر سکوت اختیار کیا ہے تو یہ اس کی خدائی قبول کرنے کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ خوف ہے۔ لہٰذا اسے اپنی خدائی کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لئے امام جعفر صادقؑ کی شیعی ثقافت سے ملتی

جلتی کوئی چیز ایجاد کرنا چاہئے جس سے اس کی خدائی کا عقیدہ راسخ ہو جائے چنانچہ اس نے اپنی خدائی کو ثابت کرنے والے مکتب کو وجود میں لانے کے لئے چند صاحبانِ علم و فضل کو حکم دیا کہ اس کے کتب خانے میں جمع ہوں اور ایک دوسرے سے مدد لے کر ایسی کتاب لکھیں جو اس کی خدائی کو ثابت کرے' اس کے پیروؤں کی مذہبی پشت پناہ ہو۔ باالفاظ دیگر اس مقصد کے لئے قرآن جیسی کوئی کتاب تصنیف کی جائے۔

ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جو لوگ خلیفہ کی طرف سے اس کام پر مامور ہوئے وہ خود اس کتاب پر عقیدہ رکھتے تھے یا نہیں؟

لیکن کیونکہ مسلمان اور مذہبِ شیعہ سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم تھے ورنہ یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ انہیں کتاب لکھنے کا حکم دیتا ہم یہ تصور نہیں کرتے کہ وہ دل سے اس کی خدائی کے معتقد تھے۔ خاص طور سے اس زمانے میں جب کہ خلیفہ تندرست بھی نہیں تھا اور اس کمیٹی کے ارکان یقینی طور پر سمجھتے تھے کہ جو خدا مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق آٹھ صفاتِ ثبوتیہ اور آٹھ صفاتِ سلبیہ کا حامل ہو اسے بیمار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ صحت و بیماری اس کی مخلوقات کی ایک صفت ہے جو جسم رکھتے ہیں' ماحول سے متاثر ہوتے ہیں' غذا استعمال کرتے ہیں اور ماحول یا غذا کے مضر اثرات انہیں بیمار کرتے ہیں۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب الحکیم نے یہ قبول کر لیا کہ خدا صاحبِ اولاد ہو سکتا ہے اور یہ مان لیا کہ مسیحؑ خدا کے فرزند ہیں تو بیت المقدس میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے مسیحیوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

یہ نظریہ قابلِ اصلاح ہے اور یہ جاننا ضروری ہے کہ جب فاطمی خلفاء ایک سلطنت کے مالک بنے اور منجملہ متعدد علاقوں کے فلسطین بھی ان کے زیرِ نگین آیا تو انہوں نے مسیحی زائرین کو بیت المقدس جانے سے نہیں روکا اور ان سے سفرِ زیارت کے لئے محصول بھی وصول نہیں کرتے تھے۔ بیت المقدس کے مسیحی زائرین پر سخت گیری اس وقت سے شروع ہوئی جب فلسطین پر سلجوقیوں کا تسلط ہوا اور بیت المقدس ان کے زیرِ

اقتدار آ گیا۔ یہ مسیحیوں کے مقدس مقامات پر قبضے کے بعد بیت المقدس جانے والے مسیحی زائرین سے محصول وصول کرتے تھے اور بتدریج اس میں اتنا اضافہ کیا کہ زائرین کو اس کی ادائیگی دشوار ہو گئی۔

۱۰۹۵ء میں مسیحی کلیسا کے سربراہ پوپ اور بن دوئم نے کیتھولک مذہب کی بڑی کانفرنس میں جو فرانس کے شہر کلرمول میں منعقد ہوئی تھی کہا کہ آج ایک زائر جب زیارت کے لئے فرانس سے بیت المقدس جاتا ہے اور اسے آمد و رفت کے اخراجات سے تین گنا زیادہ رقم بیت المقدس میں داخلے کے لئے ادا کرنا پڑتی ہے۔ اگر اس مقررہ محصول سے ایک پیسہ بھی کم ہوتا ہے تو اسے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ اب مسیحیوں کی آزادی کے ساتھ بیت المقدس جاسکنے کے لئے جنگ کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے' چنانچہ یہی وہ شخص تھا جس نے پہلی صلیبی جنگ کے لئے پیشقدمی کی اور اسی وقت ۱۰۹۵ء میں سلجوقیوں سے مقابلے کے لئے ایک لشکر روانہ کیا اور اس لشکر کے جانے اور واپس آنے کی مدت نے ۱۰۹۹ء تک طول کھینچا لیکن بیت المقدس کو سلجوقیوں سے آزاد نہیں کرا سکا۔

اس فوج نے فلسطین میں سخت شکست کھائی اور باقی ماندہ سپاہی دردناک حالت میں یورپ واپس پہنچے۔ یورپ اور دنیا کی تاریخ میں یہ جنگ پہلی صلیبی جنگ کہی گئی' کیونکہ جتنے مسیحی اس سفر اور لڑائی میں شریک تھے انہوں نے صلیب کی شکل کا ایک کپڑے کا ٹکڑا اپنے لباس پر ٹانک لیا تھا۔ مسیحیوں نے اس پہلی جنگ سے کچھ تلخ تجربے حاصل کئے جن سے انہوں نے بعد کی صلیبی لڑائیوں میں فائدہ اٹھایا۔

بہرحال فاطمی خلفاء کے دور تک جب فلسطین سلجوقیوں کے تصرف میں نہیں آیا تھا کوئی شخص مسیحی زائروں کو نہ بیت المقدس جانے سے روکتا تھا نہ ان سے محصول وصول کرتا تھا۔

الحکیم کے بارے میں اس بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کا خدائی کا دعویٰ بھی امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کو متزلزل اور ختم نہیں کرسکا۔ اور اس کی زندگی

زمانے کا احساس نہ کریں تو وقت کو نہ پہچان سکیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی وقت شناسیٔ بھوک یا طلوعِ صبح یا غروبِ آفتاب کی وجہ سے ہو' لیکن بہرحال جیسا کہ ہم بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں بعض اقسام کے جانور وقت شناس ہوتے ہیں اور اس چیز سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ زمانے کا احساس کرتے ہیں۔

یونانی فلسفی زمانے کی ذاتی غیرموجودگی کے ثبوت میں جو دلائل پیش کرتے تھے ان میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ انسان جس وقت بے ہوش ہوجاتا ہے تو زمانے کی رفتار محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ اگر کئی شب و روز بے ہوش رہے تو ہوش میں آنے کے بعد وہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس حالت میں اس پر کتنی مدت گزری ہے۔ اگر زمانہ ذاتی موجودیت کا حامل ہوتا تو ہوش میں آنے کے بعد محسوس ہونا چاہئے تھا کہ کتنے دنوں تک بے ہوشی طاری رہی۔ اگر گہری نیند طاری ہوجائے تب بھی بیداری کے بعد محسوس نہیں کیا جاسکتا کہ کتنی دیر تک سوئے ہیں بجز اس صورت کے کہ دن میں سورج اور رات میں ستاروں کے ذریعے اندازہ کریں۔

وجودِ زمانہ کے حامی کہتے تھے کہ زمانے میں بہت چھوٹے چھوٹے ذرّات ہوتے ہیں اور وہ اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ ہم انہیں محسوس نہیں کرتے اور حواسِ باصرہ' لامسہ اور سامعہ وغیرہ ان کے ادراک پر قادر نہیں ہیں۔ زمانے کے ذرّات ہمیشہ متحرک رہتے ہیں اور ایک طرف سے آکر دوسری طرف جاتے ہیں ہم اگرچہ ان کی رفتار محسوس نہیں کرتے لیکن خود اپنے اندر زمانے کے گزرنے کو زندگی کے ادوار کی تبدیلی کی صورت میں محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بچپن کے دور سے جوانی کے دور میں پھر رشد و کمال اور اس کے بعد ضعیفی اور پیرانہ سالی کے عہد میں پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے گرد و پیش ہمارا مشاہدہ ہے کہ بچے جو پہلے شیرخوار تھے بڑے ہوکر جوانی کے مرحلے میں داخل ہوگئے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مرغی کے چوزے اور بکری کے بچے بڑے ہوجاتے ہیں اور چھوٹے پودے وقت گزرنے پر تناور درخت بن جاتے ہیں۔

جو لوگ زمانے کے ذاتی وجود پر عقیدہ رکھتے تھے وہ کہتے تھے کہ زمانے کی دو قسمیں

ہیں۔ ایک وہ جس کے ذرات گزرتے رہتے ہیں اور ہم اس کا احساس رکھتے ہیں اور یہ وہی ہے جو درختوں اور جانوروں کے تغیر کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس کے ذرات گزرتے ہیں بلکہ ان مٹی یا ریت کے ذروں کے مانند جو نہر وغیرہ میں تہ نشین ہوجاتے ہیں' باقی رہتے ہیں۔ اس قسم کے زمانے میں حرکت نہیں ہوتی جس سے وہ ایک جگہ سے آئے اور دوسری جگہ چلا جائے۔ اس غیر متحرک اور ساکن زمانے کو ابدیت کہتے ہیں۔

یونان کے قدیم فلسفیوں کے نزدیک ابدیت خداؤں کا زمانہ ہے اور متحرک زمانہ انسان اور دیگر موجوداتِ عالم کا اور چونکہ خداؤں کے لئے زمانہ بے حرکت اور ساکت ہے لہٰذا ان کی حالت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا لیکن نباتات و حیوانات اور انسان چونکہ متحرک زمانے سے متعلق ہیں لہٰذا وہ بدلتے رہتے ہیں اور اس تغیر کی کسی شکل کو روکا نہیں جاسکتا۔ اگر کسی روز درخت یا جاندار کی شکل میں تبدیلی کو روکا جاسکے تو وہ خداؤں کی منزل میں پہنچ جائے گا' کیونکہ بے حرکت و ساکن زمانے سے بہرہ مند ہوگا۔

آیا یہ ممکن ہے کہ ایسا واقعہ پیش آئے اور وہ نباتات و حیوانات غیر متحرک اور ساکن زمانے سے بہرہ مند ہوں یعنی یہ موجودات جن میں انسان بھی شامل ہے خداؤں کے مانند ہوجائیں؟

حکماء یونان کہتے تھے کہ ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔ اور یہ وہی یونانی عرفان ہے جس کے بعض حکمائے یونان مرید تھے اور چاہتے تھے کہ خود کو خداؤں کے درجے تک پہنچادیں چنانچہ ان میں سے ہر ایک حصولِ مقصد کے لئے ایک راستہ اختیار کرتا تھا مثلاً ایک صاحبِ اختراع فلسفی زانن جورواقی کے نام سے مشہور تھا (کیونکہ آتن کے رواق میں درس دیتا تھا) خداؤں کے درجے تک پہنچنے کو اس چیز پر منحصر سمجھتا تھا کہ نفس کشی کی جائے اور اپنے اندر ہوا و ہوس کو فنا کردیا جائے۔

وہ کہتا تھا کہ آتن جیسے جمہوری شہروں میں صرف قانون کے ذریعے آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی بلکہ آزادی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب افراد جہادِ اکبر کریں یعنی

اپنے نفس سے جہاد کریں۔ جس وقت نفس مرجاتا ہے اور ہوا و ہوس کی سرکشی اشخاص کو انفرادی اور اجتماعی حقوق پر دست درازی کے لئے آمادہ نہیں کرتی تو سب لوگ آزادی سے بہرہ مند ہونے لگتے ہیں۔

دوسرا فلسفی اپیکو جوزانن رواقی سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل پیدا ہوا اور ۲۷۰ قبل مسیح میں انتقال کرگیا ساکت اور بے حرکت زمانے سے استفادہ کرنے اور خداؤں کی منزل تک پہنچنے کی یہ صورت سمجھتا تھا کہ انسان تمام نعمات اور عطایا سے مستفید ہو لیکن اعتدال کی حدود میں۔

اس کے ہم عصر دوسرے فلسفی ڈیوژن نے ساکن اور غیر متحرک زمانے سے فائدہ اٹھانے اور خداؤں سے ملنے کا یہ طریقہ بتایا کہ ہر چیز سے دست بردار ہوکر ایک گوشے میں زندگی بسر کی جائے۔ چنانچہ ایک روز جب اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا اپنے چلّو سے پانی پی رہا ہے تو اپنا پانی پینے کا چھوٹا سا لکڑی کا پیالہ بھی پھینک دیا اور کہا کہ یہ دنیاوی سامانِ آرائش میں سے ایک چیز ہے جو خداؤں سے ملحق ہونے میں حائل ہے۔

اس جگہ یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ یونان اور مشرقی ممالک کے عرفان میں خداؤں تک پہنچنے کی ایک کلّی راہ دکھائی گئی ہے اور وہ نفسانی ہوا و ہوس پر قابو رکھنا ہے۔ چنانچہ اس حیثیت سے قدیم یونان اور قدیم مشرق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف خواہشِ نفس کی روک تھام کے پیمانے میں ہے۔ بعض عرفاء مثلاً یونان میں ڈیوژن صرف شرمگاہوں کے چھپانے کے علاوہ دوسرے کپڑے کو خداؤں سے ملحق ہونے میں مانع سمجھتا تھا۔ یہ تصور کہاں سے آیا ہے جو یونان اور مشرق میں ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہخامنشیوں سے قبل یونان اور مشرق کے درمیان کوئی علمی و ادبی رابطہ موجود نہیں تھا۔ یہ رابطہ ہخامنشیوں کے دور سے شروع ہوا ہے لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا بننے کے لئے نفس کے ساتھ جہاد کرنے کا خیال مشرق سے یونان پہنچا یا یونان سے مشرق کی طرف آیا۔

یہ خیال چین کے اندر کنفیوشس، ہندوستان کے اندر مہاتما بدھ اور ایران کے اندر

زردشت کی مذہبی تعلیمات میں موجود نہیں ہے اور انہوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ نفس کشی کرو تاکہ خدائی کے مرتبے پر پہنچ جاؤ بلکہ یہ تصور یونان اور مشرق کے عرفانی مکاتب کے اندر وجود میں آیا، بغیر اس کے کہ دونوں کے درمیان کوئی ثقافتی اور فکری رابطہ موجود رہا ہو۔

آیا اس موضوع سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ عرفان کی جانب رجحان انہیں لوگوں کے درمیان ابھرا جو دنیاوی اقتدار سے محروم تھے اور خود کو کمزور محسوس کرتے تھے۔ لہٰذا وہ کہنے لگے کہ خدا سے ملنے کا راستہ ہوا و ہوس سے پرہیز اور نفس کے خلاف جہاد ہے اور اگر اس رجحان کے حامل اس طبقے کے افراد ہوتے جو دنیاوی لحاظ سے صاحبِ اقتدار تھا تو وہ خدا سے اتصال کے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتے؟ لیکن کیونکہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات صاحبانِ اقتدار بھی عرفان کی جانب مائل ہوتے تھے اور ہر طرح کی آزادی اور خود مختاری کے باوجود اپنے نفس پر قابو رکھتے تھے۔ لہٰذا مذکورہ بالا خیال ایک بلا استثناء اصول نہیں کہلا سکتا۔ بعد کے ادوار میں حکماء زمانے کے منکر ہوئے اور انیسویں صدی عیسوی میں یہ انکار علمائے یورپ کے درمیان عام ہوگیا۔ وہ کہنے لگے کہ زمانے کا کوئی وجود نہیں ہے جو کچھ ہے وہ صرف مکان ہے کچھ لوگ مکان کے بھی منکر ہوگئے اور انہوں نے کہا کہ مکان بذاتِ خود کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس کا وجود تبعی اور مادے کا محتاج ہے۔ اگر مادہ موجود ہے تو مکان ہے ورنہ نہیں۔

عام افراد کی نگاہوں میں یہ نظریہ محسوسات کا انکار تھا اور ہے جو شخص چند میٹر لمبے، چوڑے اور اونچے کمرے میں بیٹھا ہو اس کے طول و عرض اور بلندی کو دیکھ رہا ہو اور محسوس کررہا ہو کہ وہ کمرہ ایک مکان ہے وہ اس کو تسلیم نہیں کرسکتا کہ مکان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن انیسویں صدی نیز عہدِ حاضر کے چند دانشور وجودِ مکان کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں جو کچھ مکان کی صورت میں نظر آتا ہے اور طول و عرض و عمق رکھتا ہے وہ مکان نہیں بلکہ مادہ ہے اور یہ مادہ ہی ہے جو مکان کو وجود میں لاتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح عبارت میں یہ کہ مادہ خود مکان ہے۔ جہاں مادہ ہوگا وہیں مکان ہوگا اور جہاں مادہ نہ ہوگا مکان بھی نہ ہوگا۔

جب مکان کا انکار کرنے والے کسی دانشور سے پوچھا جاتا ہے کہ اگر مکان نہیں ہے تو ہوائی جہاز جو بہت تیزی کے ساتھ ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں اور ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف جاتے ہیں وہ کس چیز میں پرواز کرتے ہیں؟ تو جواب دیتے ہیں کہ مادے میں۔

عام افراد کے محسوسات اور عقول اس بات کو قبول نہیں کرسکتیں کہ فضائی راکٹ جو آج زہرہ اور مریخ جیسے سیاروں کی طرف جارہے ہیں مادے میں پرواز کرتے ہیں کیونکہ زمین سے دو یا تین ہزار میٹر کے فاصلے تک تو شاید ہوا (مادہ) کے ذرات موجود ہوں لیکن اس کے بعد ہوا میں ذرّات موجود نہیں ہیں اور جس دائرے میں یہ راکٹ پرواز کرتے ہیں ایک خالی فضاء ہے اور اس میں موجوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں پائی جاتی جیسے نور کی موجیں، برقی موجیں اور مقناطیسی موجیں اور قوتِ جاذبہ کی موجیں۔ وہاں مادے کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا جس میں فضائی راکٹ پرواز کریں۔ لیکن یہ مخالفینِ مکان کہتے ہیں کہ یہ فضاء جس میں راکٹ پرواز کرتے ہیں اس فاصلے کی مانند ہے جو ایٹم اور اس کے الیکٹرانوں کے درمیان موجود ہے۔ ایٹم اور اس کے الیکٹرانوں کے فاصلے کا تناسب سورج اور سیاروں کے فاصلے کے مانند ہے۔ ایٹم کے اندر یہ فاصلہ جزو مادہ ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مادے کا جزو نہیں ہے۔

اسی طرح جو فاصلہ زمین و سورج اور زہرہ و سورج وغیرہ کے درمیان موجود ہے وہ بھی جزوِ مادہ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قوتِ جاذبہ اس سے گزرتی ہے اور قوتِ جاذبہ مادے سے یا مادہ قوتِ جاذبہ سے جدا نہیں ہے۔

اس نظریئے میں جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ انرجی اور مادے کا فرق ہی ختم ہوگیا ہے اور دونوں ایک ہی سمجھ لئے گئے ہیں۔ اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قوتِ جاذبہ مادہ ہے اور مادہ قوتِ جاذبہ ہے اور ان میں باہم کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دانشور اٹھارہویں صدی عیسوی ہی سے اس جانب متوجہ ہوگئے تھے کہ مادہ اور انرجی ایک ہی چیز کی دو شکلیں ہیں۔ لیکن مادے کے خواص کو انرجی کے خواص سے الگ جانتے تھے۔

البتہ جدید علمِ طبیعیات میں مادہ اور انرجی کی تعریف اس طرح سامنے آئی ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کہ مادہ کیا ہے اور انرجی کیا چیز؟

بیسویں صدی کے آغاز تک کہا جاسکتا تھا کہ مادہ انرجی کے مجموعہ سے عبارت ہے اور انرجی عبارت ہے مادے کی امواج سے، لیکن اب بھی یہ تعریف مادہ اور انرجی کی شناخت کے لئے کافی نہیں ہے۔کیونکہ جب قوتِ جاذبہ ہی مادہ ہوگئی تو مادہ جو آج تک انرجی کے مجموعے کی شکل میں پہچانا جاتا تھا لامتناہی ہوجائے گا۔ اور اس تعریف کے تحت لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ عالمِ ہستی میں مادے کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہیں ہے اور ہوائی جہاز یا راکٹ مادے میں پرواز کرتے ہیں۔

لیکن اس چیز کا قائل ہونا کہ مکان کا کوئی وجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ مادہ ہے ابھی تھیوری کے مرحلے سے آگے نہیں بڑھا اور علمی قانون کا حامل نہیں بنا ہے۔ البتہ ہمیں اس میں شبہ نہیں ہے کہ قوتِ جاذبہ کی لہروں کی سرعت میں جسم لامتناہی ہوجاتا ہے۔ اور اس نظریئے کی بنیاد پر مادہ لامتناہی ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ کائنات میں مکان کا وجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے مادہ ہے، ان کے نظریئے کو واضح کرنے کے لئے ہم ایک اور مثال دے رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات میں ایک کھرب کہکشائیں موجود ہیں جو محض تخمینہ ہے اور وہ بھی حقیقت سے قریب نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے ان کی تعداد اس سے دو چند یا کئی گنا زیادہ ہو۔ ان کہکشانوں نے خود اپنے اندازے کے لحاظ سے کائنات میں مکان پیدا کیا ہے اور خود ہی اس میں جاگزیں ہوئی ہیں۔

اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک ہزار کہکشائیں اور پیدا ہوجائیں جب کہ ہماری عقل کہتی ہے کہ اب ان مزید کہکشانوں کے لئے جگہ نہیں ہے، کیونکہ جس قدر مکان

موجود تھا وہ موجودہ کہکشانوں سے پر ہوچکا ہے' یہ عالم ایک بڑے آڈیٹوریم کی مانند ہے جس کی تمام نشستیں پر ہوچکی ہیں اور جس میں مزید کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنے والے کہ مکان موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے مادہ ہے' بتاتے ہیں کہ اگر مزید ایک ہزار ملین کہکشانوں کا وجود میں آنا طے ہوجائے تو ان کا مکان بھی وجود میں آجائے گا اور کہکشانوں کا مکان وہی جرم (یعنی مادہ) ہے جو انہیں وجود میں لاتا ہے۔

ماہرینِ طبیعیات کے اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ لامتناہی کائنات میں مادے کی موجود مقداروں پر مزید اضافہ کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ جب ہم تماشاگاہ کے ایک ایسے ہال کو پیشِ نظر رکھیں۔ جس کا طول و عرض اور بلندی لامحدود ہو' اور اس کی نشستوں کا شمار بھی محدود نہ ہو تو اگر موجودہ تماشائیوں پر ایک ملین "یعنی دس لاکھ" تماشائیوں کا اور اضافہ ہوجائے تب بھی جگہ کی تنگی محسوس نہ ہوگی اور ان بعد میں آنے والے دس لاکھ یا دس کروڑ تماشائیوں کے لئے بھی جگہ ہوگی۔

مکان کے وجود سے انکار کرنے اور ہر چیز کو مادہ کہنے والوں میں ہر صاحبِ عقل کے استنباط میں یہ فرق ہے کہ ان کے نزدیک پہلے مکان موجود ہونا چاہئے اس کے بعد اس میں کہکشاں کا وجود قائم ہوگا اور مکان کی غیر موجودگی کے حامی کہتے ہیں کہ جو کہکشاں وجود میں آتی ہے وہی مکان بھی ہے اور خود وہی ابعادِ ثلاثہ یعنی طول و عرض و عمق کا جسم ہمارے محسوسات کی بناء پر اس طرح نظر آتا ہے حالانکہ ایک ایسی باشعور شخصیت جو فقط ایک بعُد یعنی طول کو محسوس کرتی ہے اس کے لئے محال ہے کہ عرض کو بھی محسوس کرسکے اور اس کے لئے ایک مربع جس میں طول و عرض ہے یا ایک دائرہ کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

اسی طرح جو باشعور موجود صرف طول و عرض کا احساس کرتا ہے اور یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک مربع یا ایک دائرہ کیسا ہوتا ہے اس کے لئے یہ سمجھ لینا محال ہے کہ ایک سہ بعُدی منظر جو طول و عرض اور عمق کا حامل ہے' مثلاً ایک صندوق یا ریل کا ڈبہ کس نمونے کا ہوتا ہے؟

اسی قیاس پر ہم جیسے افراد جو ابعادِ ثلاثہ (طول و عرض و عمق) کا احساس کرسکتے ہیں چوتھے بعُد کو محسوس نہیں کرسکتے' درحالیکہ ریاضی کے ماہرین کو چوتھے بعُد کی موجودگی کا اتنا یقین ہے کہ انہوں نے چار بعُدی حجم کے شمار کے ساتھ ایک چار بعُدی ہندسہ بھی تجویز کرلیا ہے۔

چونکہ یہ لوگ چوتھے بعُد کے قائل ہیں لہٰذا پانچویں اور چھٹے بعُد کے بھی قائل ہیں۔ لیکن کسی سننے اور پڑھنے والے کے لئے سہ بعُدی حجم کی مانند ان کے وجود کو مجسّم کرکے پیش نہیں کرسکتے۔

جس وقت سے خلا نوردی کا آغاز ہوا مادہ شناسی کے لحاظ سے ماہرینِ طبیعیات کی معلومات میں کچھ مزید اطلاعات کا اضافہ ہوا ہے جن میں ایک یہ ہے کہ کرہ ارضی میں جتنے اجسام ہیں ان سے مسلسل قرمزی رنگ کی لہریں خارج ہوتی ہیں۔ پہلے یہ تصور کیا جاتا تھا کہ قرمزی رنگ کی لہریں صرف گرم اشیاء سے خارج ہوتی ہیں لیکن جو سیارے مستقل طور پر زمین کے گرد گردش کررہے ہیں ان کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی منجمد برف سے بھی یہ لہریں برابر خارج ہوتی ہیں۔ جن تجربہ گاہوں میں اجسام کو شدید برودت میں رکھا جاسکتا ہے وہاں آزمائش کی گئی ہے کہ بہت ہی سرد جسموں سے بھی یہ لہریں نکلتی ہیں اور اب علمِ طبیعیات کے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کرہ ارض میں کوئی ایسا جسم نہیں ہے جس سے مذکورہ بالا لہروں کا اخراج نہ ہوتا ہو' سوائے اس جسم کے جس کی برودت صفر مطلق کے درجے پر پہنچ گئی ہو اور برودت صفر مطلق درجہ برودت کا وہ پیمانہ ہے جب مادے کے اندر ذرّات (Molecules) کی حرکت ٹھہر جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت ان دوربینوں کے ذریعے جو قرمزی رنگ کی لہروں یا شعاعوں کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ ہر چیز کو دیکھا جاسکتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں یہ دوربینیں ہوں ان کی نگاہوں سے شب کے وقت کسی چیز کو پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ خشک گھاس اور مردہ جانور کے مقابلے میں ہری گھاس اور زندہ

جانور کے جسم سے یہ موجیں زیادہ خارج ہوتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اب میدانِ جنگ میں کسی ٹینک یا توپ یا بکتر بند گاڑی کو درختوں کی شاخوں یا گھاس وغیرہ سے چھپا کے دشمن کی نگاہوں سے اوجھل نہیں کیاجاسکتا کیونکہ دشمن ایسی دوربین سے جو اشیاء کو ان قرمزی شعاعوں کے توسط سے دیکھنے کے لئے مخصوص ہوتی ہے' دیکھتا ہے کہ ان شاخوں اور پتوں کے مقابلے میں جو جڑوں کے ذریعے زمین سے متصل ہوتے ہیں صرف دسواں حصّہ لہریں خارج ہورہی ہیں لہٰذا سمجھ لیتا ہے کہ یہ شاخیں اور پتے جڑوں کے ذریعے زمین سے ملحق نہیں ہیں' یعنی انہیں کاٹ کر الگ کرلیا گیا ہے اور لازمی طور پر انہیں ٹینک یا توپ یا بکتر بند گاڑی کو پوشیدہ رکھنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طریقے سے میدانِ جنگ میں سپاہیوں کے جسموں سے بھی مذکورہ قرمزی لہریں یا شعاعیں نکلتی ہیں۔ لہٰذا اس دور میں رات کے وقت انہیں مخالف فوج کے محافظوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رکھاجاسکتا۔ سوائے اس صورت کے کہ ان کے پاس ایسی دوربینیں موجود ہی نہ ہوں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ تمام اجسام سے یہ لہریں خارج ہوتی ہیں' سوائے اس جسم کے جس کی برودت صفر مطلق کے درجے پر ہو۔ برودت صفر مطلق کا درجہ ۱۰۰ ڈگری والے (تھرمامیٹر) میں ۲۷۳٫۱۵ درجہ اور ۴۵۹٫۶ درجہ فارن ہائیٹ بتایا گیا ہے۔

ہنوز یہ درجۂ برودت ماہرینِ طبیعیات کے خیالات تک محدود ہے کیونکہ آج تک کسی تجربہ گاہ میں بہت زیادہ دباؤ کے باوجود بھی اتنی برودت پیدا نہیں کی جاسکی ہے۔

دنیا کی تجربہ گاہیں سو ڈگری والے تھرمامیٹر کے ذریعے منفی دو سو بیس درجے تک برودت حاصل کرسکی ہیں' لیکن اس کے بعد اجسام کو مزید سرد کرنے میں بہت مشکلات کا سامنا ہے۔ چنانچہ ایک درجے کے ہر دسویں حصے کے لئے بھی عظیم وسائل کو کام میں لانا ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ کرۂ ارض میں آج تک برودت صفر مطلق کو وجود میں نہیں لایا جاسکا جس سے معلوم کیا جاسکے کہ اجسام میں ذرّات (Molecules) کا مکمل ٹھہراؤ کیا اثر

دکھاتا ہے؟ اور کیا اس کی وجہ سے ایٹموں میں بھی کوئی اثر پیدا ہوتا ہے؟

کیونکہ مادے سے متعلق معلومات میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے لہٰذا خیال کیا جاتا ہے کہ جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہستی ایک لامتناہی مادے کے سوا اور کچھ نہیں اور جو کچھ ہمیں خلاء کی مانند نظر آتا ہے وہ مادے کی اٹھتی ہوئی لہریں ہیں' ان کا قول بے بنیاد نہیں ہے اور اس کے نتیجے میں یہ کہنا کہ مکان کا کوئی وجود نہیں اور جو کچھ موجود ہے صرف مادہ ہے' شاید بے وجہ نہ ہو۔ لیکن جب تک یہ تھیوری علمی قانون کی شکل میں نہیں آتی اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

ہم عصر ماہرینِ طبیعیات میں سے ایک ایزک آسیموف ہیں جو روس میں پیدا ہوئے اور پھر امریکہ ہجرت کرگئے اور اب وہیں ملازمت کر رہے ہیں۔ یہ مکان کے بارے میں ایک جدید نظریہ پیش کرتے ہیں جسے اگر ہم علمی اصطلاحات اور ریاضی کے فارمولوں سے الگ کرکے دیکھیں تو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ مکان عبارت ہے مادے اور اس کی لہروں سے' اس ترتیب سے کہ مادۂ اصلی عبارت ہے ایٹم کے مرکز یا مرکزوں سے۔ ان کے جمع ہونے کے بعد اس مرکز سے مستقل طور پر موجیں خارج ہوتی رہتی ہیں۔ یہ لہریں مرکز کے قریب کثیف ہوتی ہیں اور جس قدر مرکز سے دور ہوتی جاتی ہیں ان کی کثافت کم ہوتی جاتی ہے لیکن ان کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

ہم اس ایٹمی مرکز کو چراغ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ چراغ کے گرد اس کی روشنی زیادہ اور تیز ہوتی ہے' لیکن ہم جس قدر چراغ سے دور ہوں اس کی روشنی کم ہوجاتی ہے لیکن اس کی تیز رفتاری میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اگر ہم چراغ سے اس قدر دور ہوجائیں کہ اس کی روشنی نظر نہ آئے تب بھی یہ روشنی موجود رہتی ہے۔

اور اس کی لہریں اسی تیزی سے یعنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چاروں طرف پھیلتی رہتی ہیں۔ صرف ہماری آنکھ تک نہیں پہنچتیں۔

ہماری آنکھ' کان اور قوتِ لامسہ لہروں کو محسوس کرنے میں ایک حد رکھتی ہیں۔ اگر لہروں کی حرکت اس حد میں نہ ہو تو نہ ہماری آنکھ روشنی کو دیکھتی ہے اور نہ ہمارے

ایک طولانی مدت کے بعد مادے میں بدل جاتی ہے تو یہ بھی ایک تھیوری ہے کیونکہ ہم نے اب تک انرجی کو مادے میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھا ہے اور قطعی طور سے نہیں کہہ سکتے کہ انرجی مادے میں بدل جائے گی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مادہ انرجی میں بدل جاتا ہے تو عقلی طور پر اندازہ لگاتے یا فرض کرتے ہیں کہ انرجی بھی مادے میں بدل جاتی ہے۔

البتہ اس گمان و فرضیہ اور علم الیقین کے درمیان بہت فاصلہ ہے اور علم میں اندازے اور فرضیہ پر تکیہ نہیں کیا جاسکتا۔ خلاصہ یہ کہ اس دور کا ماہرِ طبیعیات اور امریکی یونیورسٹی کا استاد ایزک آسیموف وجودِ مکان کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ مکان کا کوئی وجود نہیں ہے جو کچھ ہے مادہ یا اس کی موجوں کی حرکت ہے اور ہمارے لئے مکان کا احساس انہیں موجوں پر مبنی ہے۔

کیونکہ یا تو ہم آزاد فضا میں چل رہے ہوتے ہیں یا اپنے کمرے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس دوران لہریں ہمیں اپنی آغوش میں لئے ہوتی ہیں لہٰذا ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی مکان میں ہیں۔ اب اگر یہ لہریں رک جائیں اور ہم ان کی آغوش میں نہ رہیں تو ہمیں اپنا وجود ایک مکان میں محسوس نہ ہوگا۔

آیا یہ ممکن ہے کہ موجیں منقطع ہوجائیں اور ہم (بقول آسیموف) مکان کا احساس نہ کریں؟

یہاں علمِ طبیعیات کہتا ہے کہ نہیں!

کیونکہ سخت اندھیری راتوں میں نور کی وہ لہریں جنہیں ہم نہیں دیکھتے ہمیں آغوش میں لئے ہوئے ہیں اور انتہائی خاموش فضاؤں میں مختلف آوازوں کی موجیں جنہیں ہم نہیں سنتے ہمارے گرد متحرک ہیں اور ان میں سے بعض ہمارے جسموں سے گزرتی ہیں۔

اگر فرض کیا جائے کہ تمام موجیں قطع ہوسکتی ہیں تب بھی عمومی قوتِ جاذبہ کی موج کسی حال میں یہاں تک کہ راکٹوں میں خلابازوں کی بے وزنی کی حالت میں بھی

منقطع نہیں ہوتی اس حالت میں بھی راکٹ کی تیز رفتاری زمین کی قوتِ جاذبہ سے ایک توازن قائم کرتی ہے جو راکٹ سے نکلنے والے خلاباز کو گرنے سے روکتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ راکٹ میں یا اس کے باہر خلاباز قوتِ جاذبہ کے زیرِ اثر نہیں رہتے۔

علمِ طبیعیات کے مطابق مادے سے قوتِ جاذبہ کی وابستگی اتنی زیادہ ہے کہ اگر یہ قوت الگ کرلی جائے تو مادہ ہی باقی نہیں رہے گا اور کسی جاندار یا بے جان مخلوق کا قوتِ جاذبہ کی لہریں منقطع ہونے کے بعد ایک لحظہ بھی باقی رہنا محال ہے ——

یہ زمان و مکان کے بارے میں انیسویں اور بیسویں صدی کے ماہرینِ طبیعیات کے نظریئے کا ماحصل ہے۔

اب اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ آج سے ساڑھے بارہ سو سال قبل ایک شخصیت انہی نظریات کو پیش کرچکی ہے تو کیا وہ لائقِ آفرین نہیں ہے؟ اور کیا وہ اس کی حقدار نہیں ہے کہ ہم اس کی اعلیٰ دماغی کی تعریف و تحسین کریں؟

اور یہ ذات تھی امام جعفر صادقؑ کی جنہوں نے دوسری صدی ہجری کے نیمۂ اوّل میں زمان و مکان کے لئے وہ نظریئے پیش کئے جو آج کے نظریات کے مطابق ہیں باوجودیکہ آپ کے نظریات میں کوئی علمی اصطلاح اور فارمولا نہیں ہے لیکن ہم جدید نظریات سے ان کی مطابقت کرسکتے ہیں۔

آپ کہتے ہیں کہ زمانہ بذاتِ خود موجود نہیں ہے اس کا وجود صرف ہمارے احساسات پر قائم ہے اور زمانہ ہمارے لئے عبارت ہے دو واقعات کے درمیان موجود فاصلے سے۔ آپ کے نظریئے کے مطابق، روز و شب زمانے کے نمونے نہیں ہیں بلکہ زمانے کے علاوہ ہیں اور آج بھی ان سے مستقل مدت معلوم نہیں ہوتی۔ کبھی دن بڑا ہوتا ہے اور رات چھوٹی، کبھی رات بڑی ہوتی ہے اور دن چھوٹا اور کبھی ہم دونوں کو برابر محسوس کرتے ہیں۔

مکان کے لئے آپ کا نظریہ تھا کہ یہ ذاتی نہیں بلکہ تبعی ہے، یہ ہمیں طول و عرض و عمق والی فضاء کی شکل میں نظر آتا ہے اور عمر کے ہر عہد میں اس کا وجود فرق رکھتا

ہے۔ چھوٹے گھر میں رہنے والا بچّہ اس کے احاطے کو وسیع میدان سمجھتا ہے' لیکن بیس سال کے جوان کو وہی گھر بہت چھوٹا نظر آتا ہے اور وہ اس پر تعجب کرتا ہے کہ کل یہ کس قدر وسیع تھا اور آج کیسے چھوٹا اور تنگ ہوگیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں مکان کا وجود تبعی ہے اور آج بھی جیسا کہ ہم نے بتایا کہ ماہرینِ طبیعیات کی ایک جماعت بھی یہی نظریہ رکھتی ہے۔

---☆---☆---

امام جعفر صادقؑ کے نزدیک بعض بیماریوں کے اسباب

امام جعفر صادقؑ کا ایک اور نظریہ جو آپ کی علمی برتری کو ثابت کرتا ہے بعض روشنیوں کے ذریعے بیماری کے انتقال سے متعلق ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ بعض روشنیاں ایسی ہیں جو اگر ایک بیمار سے ہو کر تندرست انسان تک پہنچیں تو اسے بھی بیمار کرسکتی ہیں۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہاں ہوا یا میکروب (جس سے دوسری صدی ہجری کے نیمہ اوّل میں لوگ ناواقف تھے) کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ روشنی کا ذکر ہے' وہ بھی ہر روشنی کا نہیں بلکہ بعض روشنیوں کا جو اگر بیمار آدمی سے گزر کر تندرست آدمی پر منعکس ہوں تو ممکن ہے کہ اسے بھی بیمار کردیں۔

اس نظریئے کو حیاتیات اور فنِ طب کے علماء خرافات اور فضول بات سمجھتے تھے' کیونکہ ان کے عقیدے میں بیمار آدمی سے تندرست آدمی کی طرف بیماری کے منتقل ہونے کا باعث مکروب تھے یا وائرس' چاہے انتقالِ مرض کا وسیلہ حشرات الارض ہوں یا پانی یا ہوا یا دو بیمار و صحتمند آدمیوں کے درمیان براہ راست مس ہونا۔ مکروب یا وائرس کی تحقیق سے پہلے بیماریوں کے منتقل ہونے کا ذریعہ بُو کو سمجھا جاتا تھا اور قدیم زمانے میں امراض کی سرایت کو روکنے کے لیے تمام اقدامات بُو کی روک تھام کی بنیاد پر کیے جاتے تھے تاکہ کسی مرض کی بُو ایک بیمار سے تندرست انسان تک پہنچ کر اسے بھی بیمار نہ کردے۔ کسی دور میں کسی شخص نے بھی یہ نہیں کہا کہ بعض روشنیاں اگر بیمار سے

ہوتی ہوئی تندرست تک پہنچیں تو اسے بھی بیمار کردیتی ہیں۔ یہ صرف امام جعفر صادقؑ کا قول ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ دانشمندوں کی جماعت اس نظریئے کو خرافات میں شمار کرتی تھی، یہاں تک کہ جدید علمی تحقیقات نے ثابت کردیا کہ یہ نظریہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس حقیقت کا پتہ پہلی بار سوویت یونین میں لگایا گیا۔

سوویت یونین میں واقع شہر نووا سیبرسک میں، جو طبی، کیمیائی اور حیاتیاتی تحقیقات کے بڑے مراکز میں سے ہے، علمی اور ناقابلِ تردید حیثیت سے ثابت ہوچکا ہے کہ پہلے بیمار خلیوں سے شعاعیں نکلتی ہیں پھر جب ان میں سے ایک قسم کی شعاعیں صحیح و سالم خلیوں پر اپنا اثر ڈالتی ہیں تو انہیں بھی بیمار کردیتی ہیں، بغیر اس کے کہ بیمار اور صحت مند خلیے ذرا بھی ایک دوسرے سے مس ہوں اور بغیر اس کے کہ بیمار خلیوں سے میکروب یا وائرس تندرست خلیوں میں سرایت کریں۔

جو ماہرین اس شہر میں تحقیق کر رہے تھے ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ کسی زندہ وجود مثلاً دل یا گردے یا بدن کے کسی پٹھے کے ہم شکل خلیوں میں سے دو گروہ منتخب کرکے انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتے تھے اور دیکھتے تھے کہ ان خلیوں سے کتنی اقسام کے فوٹون خارج ہو رہے ہیں؟ ہم بتا چکے ہیں کہ نور کے ایک ذرے کو فوٹون کہتے ہیں اور آج شعاعوں کے مشاہدے اور تحقیق میں علم کی توانائی اتنی زیادہ ہوچکی ہے کہ فوٹون پر بھی تحقیق کی جاسکتی ہے۔

ماہرین کے دوسرے گروہ نے خلیوں کو جو سالم تھے، حفاظتی ٹیوب میں رکھا۔ پھر جانداروں کا انتخاب کرکے دو علیحدہ حصّوں میں تقسیم کیا اور ان میں سے ایک حصّے کو اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے بیمار کیا کہ آیا بیماری کی حالت میں بھی خلیوں سے شعاعیں خارج ہوتی ہیں یا نہیں؟ پھر دیکھا کہ اس حالت میں بھی فوٹون خارج ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کے سالم خلیوں کو دو حفاظتی ٹیوبوں میں رکھا جن میں سے ایک سلیکان (Silicon) کا اور دوسرا شیشے کا تھا۔ سلیکان کی یہ خاصیت ہے کہ کسی قسم کا فوٹون

یعنی کسی طرح کی شعاع (سوائے ماوراء بنفشی شعاعوں کے) اس کو عبور نہیں کرتی اور معمولی شیشے کی یہ خاصیت ہے کہ سوائے ماوراء بنفشی شعاع کے ہر فوٹون یعنی ہر قسم کی شعاع اس سے گزر جاتی ہے۔

سلیکان اور شیشے کی دو ٹیوبوں میں سالم خلیوں کو چند گھنٹے بیمار خلیوں کی شعاعوں کے مقابل رکھنے کے بعد مشاہدے سے معلوم ہوا کہ سلیکان والی ٹیوب کے سالم خلیے بھی بیمار ہوگئے تھے۔ لیکن شیشے کی ٹیوب والے بیمار نہیں ہوئے۔ سلیکان چونکہ ماوراء بنفشی شعاعوں کے علاوہ اور کسی قسم کی شعاع کو گزرنے کا راستہ نہیں دیتا تھا لہٰذا ماورائے بنفشی شعاعیں تندرست خلیوں تک پہنچ کر انہیں بیمار کردیتی تھیں لیکن شیشہ ماورائے بنفشی شعاعوں کے سوا ہر قسم کی شعاعوں کو راستہ دے دیتا تھا اور چونکہ وہ شعاعیں تندرست خلیوں پر اپنا اثر نہیں ڈالتی تھیں لہٰذا وہ اپنی سلامتی کو محفوظ رکھتے تھے اور بیمار نہیں ہوتے تھے۔

یہ بھی جان لینا چاہیے کہ وہ تمام شعاعیں جو سالم خلیوں پر چمکتی تھیں، بیمار خلیوں ہی سے خارج ہوتی تھیں لیکن چونکہ یہ خلیے شیشے کی ٹیوبوں میں تھے اور بیمار خلیوں سے نکلنے والی ماورائے بنفشی شعاعوں کی زد میں نہیں آتے تھے لہٰذا محفوظ اور سالم رہتے تھے۔

یہ تجربہ طرح طرح کی بیماریوں اور متشابہ اور مختلف خلیوں کے ذریعے بیس سال میں پانچ ہزار بار دہرایا گیا کیونکہ شہر نووا سیبرسک کے تحقیقاتی مرکز کے ماہرین یہ نہیں چاہتے تھے کہ تجربے کے نتیجے میں کوئی معمولی سا شبہ بھی باقی رہ جائے۔ ان پانچ ہزار تجربات میں سب کا نتیجہ ایک ہی رہا اور وہ یہ کہ بیمار خلیے طرح طرح کی شعاعیں خارج کرتے ہیں جن میں ماورائے بنفشی شعاعیں بھی ہوتی تھیں۔

دوسرے یہ کہ جس وقت سالم خلیے بیمار خلیوں سے نکلی ہوئی ماوراء بنفشی شعاعوں کے مقابل میں (نہ کہ دوسری ماوراء بنفشی شعاعوں کے سامنے) آتے ہیں تو بیمار ہوجاتے ہیں اور تیسرے یہ کہ ان کی بیماری بھی وہی ہوتی ہے جو مریض خلیوں میں ہو۔

ان بیس سال کے طویل تجربات میں سالم اور بیمار خلیوں کے درمیان کسی قسم کا قرب اور رابطہ موجود نہیں تھا جس سے خیال پیدا ہوتا کہ ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں وائرس یا میکروب سرایت کرتے ہیں چنانچہ ہزار تجربات کے بعد ماہرین پر ثابت ہوگیا کہ سالم خلیوں میں بیماری پیدا کرنے کی ذمہ دار وہ ماورائے بنفشی شعاعیں ہیں جو بیمار خلیوں سے خارج ہو کر ان پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ اگر ان شعاعوں کی روشنی روک دی جائے تو صحت مند خلیے بیمار نہیں ہوتے۔

اینٹی بایٹک Antibiotic (یعنی میکروب اور وائرس کی قاتل) دواؤں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ بیمار سے نکلنے والی ان شعاعوں کو کم کردیتی ہیں' یہاں تک کہ ان کا پھیلاؤ اس حد تک گھٹ جاتا ہے کہ پھر یہ مضر نہیں ہوتیں۔ روسی دانشوروں نے جو تجربے کیے ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے بدن کا ہر خلیہ ایک بھیجنے والے اور قبول کرنے والے کی مانند ہے جو شعاعیں پھینکتا بھی ہے اور ان کا اثر قبول بھی کرتا ہے اور انہیں اپنے اندر محفوظ بھی کرتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ شعاعیں ماورائے بنفشی قسم کی ہوں جو کسی بیمار خلیے سے خارج ہوں تو انہیں جذب کرنے والا سالم خلیہ بھی بیمار ہوجائے گا۔ البتہ اگر یہ شعاعیں پھینکنے والا خلیہ مریض نہ ہو تو صحت مند خلیوں پر ان کا کوئی مضر اثر نہیں پڑتا۔

متعدد تجربات میں یہ نکتہ بھی پایہ ثبوت کو پہنچا ہے کہ اگر کچھ سالم خلیے ٹاکسین (Toxine) کے اثر سے بیمار ہوں اور ماورائے بنفشی شعاعیں خارج کرتے ہوں تو یہ شعاعیں بھی بغیر باہم مس ہوئے سالم خلیوں کو بیمار کرتی ہیں۔ ٹاکسین سے مراد وہ زہر ہے جو ہمارے جسم کے اندر موجود بعض چیزیں پیدا کرتی ہیں اور جسمانی خلیوں کو بیمار کرنے کے لحاظ سے ان کا عمل میکروبوں اور وائرس کے عمل سے مختلف ہے۔

جو چیزیں خاص طور پر آدھی عمر گزرنے کے بعد جسم کے اندر ٹاکسین کی تولید میں مدد کرتی ہیں ان میں زیادہ اور مقوی غذائیں بھی ہیں۔ بہرحال ٹاکسین جو زہر ہے سالم خلیوں کو بیمار کردیتا ہے۔ تجربہ ہوا ہے کہ جو خلیے ٹاکسین کے اثر سے بیمار ہوئے ہیں اور

شعاعیں خارج کرتے ہیں وہ بھی ماوراء بنفشی شعاعوں سے سالم خلیوں کو بیمار کرتے ہیں۔ اس کا انحصار بیماریوں میں نہیں ہے جو میکروب اور وائرس سے پیدا ہوتی ہیں۔ بلکہ ٹاکسین سے پیدا ہونے والی بیماریاں بھی مذکورہ شعاعوں کے ذریعے بیمار خلیوں سے دوسرے خلیوں میں منتقل ہو کر انہیں بیمار کرتی ہیں۔

یہ بات محتاج تفصیل نہیں ہے کہ یہ علمی حقیقت جو بیس سال میں پانچ ہزار تجربوں سے ثابت ہوئی ہے ماہرین حیاتیات اور اطباء کے سامنے بیماریوں کے علاج کے لیے ایک نیا باب کھولتی ہے اور وہ بھی دو طریقوں سے' اوّل یہ کہ بدن کے بعض خلیوں میں کسی مرض کے مثلاً سرطان کے پیدا ہونے کے بعد بیمار خلیوں سے سالم خلیوں کی طرف ماورائے بنفشی شعاعوں کی روشنی کو روکا جائے تاکہ بیماری مزید نہ پھیل سکے۔ اور دوسرا پیش بندی کا طریقہ یہ ہے کہ خلیوں کو بیمار ہی نہ ہونے دیں کہ وہ شعاعیں پھینک کر سالم خلیوں کو بھی بیمار کردیں۔

عام قاعدہ ہے کہ ہر دور میں ایک جدید طریقہ علاج دریافت ہوتا ہے جس سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ ہوجاتی ہیں اور لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اس کے ذریعے سارے امراض کا علاج ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس طبی انکشاف کے بارے میں غلو سے کام نہیں لیتے اور یہ نہیں کہتے کہ تمام امراض کا جن میں سرطان بھی شامل ہے اس طریقے سے علاج کیا جاسکتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ جن دانشوروں نے یہ انکشاف کیا ہے انہوں نے بھی علاج کا طریقہ نہیں بتایا ہے اور یہ نہیں کہا ہے کہ بیمار خلیوں سے نکلنے والی ماورائے بنفشی شعاعوں کو کس طرح روکنا چاہیے۔

پھر بھی یہ انکشاف علمی حیثیت سے قابلِ توجہ ہے اور اس پر اتنا کام اور تحقیق ہوچکی ہے کہ اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں رہا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ اگر کچھ خلیے کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوں تو ہر بیماری سے ایک قسم کا فوٹون خارج ہوتا ہے اور اب وہ فوٹون کے لیے جنہیں بیمار خلیے طرح طرح کی بیماریوں کی وجہ سے خارج کرتے ہیں فہرست یا خود اپنی اصطلاح کے مطابق کوڈ تیار کرنے میں مشغول ہیں۔

اور چونکہ میکروب، وائرس اور ٹاکسین سے پیدا ہونے والی بیماریاں ایک دو نہیں ہیں للذا اس فہرست کی تیاری میں ایک طویل مدت صرف ہوگی اور سالہا سال میں اس کی تکمیل ہوسکے گی، لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ممکن ہے کہ بعض امراض کا علاج کیا جاسکے۔ مثلاً جب یہ معلوم ہوجائے کہ جو خلیے انفلوئنزا کے وائرس سے بیمار ہوئے ہیں وہ کونسی شعاعیں خارج کرتے ہیں اور جو ماورائے بنفشی شعاعیں ان سے خارج ہوتی ہیں، وہ کس قدر ہیں تو انفلوئنزا کے علاج اور سالم خلیوں کو بیماری سے محفوظ رکھنے کے لیے قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس موضوع پر امریکہ میں بھی کچھ تحقیقات ہوئی ہیں اور اس کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ انہیں نتائج سے ملتے جلتے ہیں جو روسی دانشوروں نے حاصل کیے ہیں اور امریکہ کے علمی رسائل میں ان کی جھلک نظر آتی ہے اور ایک محقق ڈاکٹر جوہن اوٹ نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسری صدی کے نیمہ اوّل میں امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ کہ بعض انوارِ تولید مرض کا سبب ہوتے ہیں اور جسے اب تک فضول اور مہمل سمجھا جاتا تھا، مہمل اور خرافات کا جزو نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھا اور آج ہم جانتے ہیں کہ ماورائے بنفشی شعاع جس وقت بیمار جانداروں سے تندرست جانداروں پر اپنا اثر ڈالتی ہے تو انہیں بھی بیمار کردیتی ہے درحالیکہ سورج کی ماورائے بنفشی شعاعیں جب جانداروں کے اوپر چمکتی ہیں تو انہیں بیمار نہیں کرتیں۔

اگرچہ سورج کا نور ماورائے بنفشی ہوا کے بغیر کسی جاندار کے جسم پر پڑے اور جسم اور ان شعاعوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو تو وہ جاندار ہلاک ہوجائے گا۔ لیکن وہی شعاعیں جب ہوا کے بیچ سے گزرتی ہوئی زمین تک پہنچتی ہیں تو کسی ذی روح کو بیمار نہیں کرتیں۔

بہرحال حیات شناسی اور طب کے جدید انکشافات نے ساڑھے بارہ سو سال کے بعد امام جعفر صادقؑ کے نظریئے کی صحت ثابت کردی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ قدیم زمانے میں انتقالِ مرض کا صرف ایک سبب سمجھا جاتا تھا اور وہ تھی بیماری کی بو۔ لیکن بہت پرانے زمانوں سے نوع بشر نے پتا لگا لیا تھا کہ بعض امراض ایک سے دوسرے انسان میں سرایت کرتے ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے ایک مصری پاپی روس (قدیم مصری اسناد کے کاغذی مکتوب) میں جو اب فرانس میں ہے لکھا ہوا ہے کہ اس مقصد سے کہ مصر کے لوگوں میں بیماری سرایت نہ کرے، مسافروں کو کشتی سے ساحل پر اترنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ سند نشاندہی کرتی ہے کہ پانچ سو سال قبلِ مسیح میں کشتیاں مصر جاتی تھیں اور مسافروں کو وہاں پہنچاتی تھیں اور آج سے تین ہزار پانچ سو سال پہلے کا دریائی سفر کم از کم بحیرۂ روم یعنی آج کے بحیرۂ احمر میں ہوا کرتا تھا اور غالباً اس خیال سے کہ راستہ نہ بھول جائیں کشتیاں ساحل کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی تھیں۔

اگر زمانۂ قدیم میں انسانوں میں سرایت کرنے والے امراض کی شناخت کے بارے میں اس پاپی روس کے علاوہ اور کوئی ماخذ موجود نہیں تھا تب بھی کافی ہے اور اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ انسان آج سے پینتیس صدی قبل بعض امراض کے ایک سے دوسرے میں سرایت کرنے سے واقف تھا۔

اب جبکہ موجودہ علوم امام جعفر صادقؑ کے مذکورہ نظریئے کو صحیح ثابت کر رہے ہیں آیا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ ایک دوسرے کو لگنے والے امراض جو کسی علاقے میں پھوٹ پڑتے ہیں، وہ بھی نور یا روشنی ہی سے پیدا ہوتے ہیں؟ چونکہ ماوراء بنفشی شعاع بیمار خلیوں سے صادر ہونے کے بعد اپنے گرد و پیش پھیل جاتی ہے تو کیا اسی وجہ سے کبھی کبھی ایسے خطے میں جہاں کے لیے تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی لگنے والی بیماری دفعتہً پیدا ہو کوئی شخص وبائی بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے؟

روسی اور امریکی محققین جنہوں نے بیمار خلیے سے سالم خلیے میں ماوراء بنفشی شعاعوں کے توسط سے بیماری کے سرایت کرنے پر تحقیق کی ہے ابھی یہ نہیں سمجھ سکے ہیں کہ اس کا اندازہ کیا ہے؟ وہ اس بات پر تو یقین رکھتے ہیں کہ یہ شعاع بیمار خلیے

سے سالم خلیے پر اثر ڈالتی ہے اور اس کو بیمار کردیتی ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ ایسا کس طرح کرتی ہے اور جب تک یہ موضوع واضح نہ ہوجائے اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ خلافِ توقع کسی علاقے میں ایک دوسرے کو لگنے والی بیماری کا ظہور ماوراء بنفشی شعاع کے باعث ہوا ہے۔

چونکہ یہاں ماوراء بنفشی شعاع کے توسط سے سرایت کرنے والے مرض پر بحث ہو رہی ہے اور ابھی علم یہ نہیں جانتا کہ ایسا کیونکر ہوتا ہے لہٰذا ہمیں کہنا چاہیے کہ ابھی علم سالم خلیے میں وائرس کے طرزِ عمل سے ناواقف ہے۔ علم یہ تو جانتا ہے کہ وائرس خلیے میں جاگزیں ہو کر تیزی سے بڑھتا ہے اور جو دوا بیمار کو دی جاتی ہے وہ وائرس کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس پہلو سے بھی کچھ چیزیں اس سے پوشیدہ ہیں کیونکہ ابھی تک علم نے نہ خلیے کو بخوبی پہچانا ہے نہ وائرس کو اور ابھی یہ بھی نہیں جانتا کہ بدن کے خلیے کیونکر بوڑھے ہوتے ہیں؟ اگر یہ جان لیتا تو بڑھاپے کی روک تھام کرلیتا۔

روسی اور امریکی ماہرین کی تحقیقات سے اب تک جو ثابت ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ایک فوٹون بھی جو نور کا ایک ذرہ ہوتا ہے اگر ماوراء بنفشی شعاع کے ذرات میں سے شمار کیا جاسکے اور ایک بیمار خلیے سے صادر ہو تو سالم خلیے کی بیماری کا سبب ہوسکتا ہے۔

اگر ہم میکروب کو فٹ بال کے ایک گولے کے برابر تصور کریں تو اس کے مقابلے میں وائرس خلیے کے ایک چھوٹے کنکر کے برابر ہوگا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ فوٹون کتنا چھوٹا ہوگا کیونکہ یہی چھوٹا ذرہ غلّے کے اس چھوٹے کنکر کے مقابلے میں بھی اتنا چھوٹا ہوگا جتنا فٹ بال کے مقابلے میں یہ کنکر اور غالباً یہی بیماری کے ایک جرثومے کو اٹھا کر سالم خلیے تک پہنچاتا ہے ورنہ وہ بیمار نہ ہوتا۔ اور اگر فوٹون بیماری کے جرثومے کو نہیں اٹھاتا ہے تو خود وہی جرثومہ ہے۔

ہم یہ قیاس کی رو سے کہہ رہے ہیں کیونکہ ہماری عقل بتاتی ہے کہ نور کا ایک ذرہ جب تک بیماری کے جرثومے کو اٹھا کر نہ لے جائے یا خود ہی جرثومہ نہ ہو کسی سالم خلیے

میں بیماری پیدا نہیں کرسکتا۔

اس کے باوجود ہوسکتا ہے کہ فوٹون کے ذریعے تولیدِ مرض کی نوعیت پر مکمل علمی تحقیق کے بعد ہم یہ سمجھیں کہ تولیدِ مرض کا سبب بالکل کچھ اور ہے جو ہم نے فرض کر رکھا ہے۔

مختلف علوم کے اندر جن میں علمِ طبیعیات بھی شامل ہے امام جعفر صادقؑ کے مخصوص اور نادر نظریات صرف اتنے ہی نہیں ہیں جتنا اب تک بیان کیا گیا ہے بلکہ آپ اور بھی ایسے بلند نظریات کے حامل ہیں جن کی آج کے علوم تائید کر رہے ہیں۔

آپ کے خاص نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خدا کے علاوہ جو چیز بھی ذاتی وجود رکھتی ہے اس کی ضد بھی موجود ہے۔ البتہ ضدین کے درمیان تصادم واقع نہیں ہوتا کیونکہ اگر تصادم ہوجائے تو بعید نہیں ہے کہ دنیا ویران ہوجائے۔

یہ نظریہ آج کے مادہ اور ضد مادہ کے نظریئے کا خلاصہ ہے جس کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں مختصر بحث کرچکے ہیں اور اب یہاں بحث کی مناسبت سے امام جعفر صادقؑ کے نظریہ کے حوالہ سے ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب یہ مسئلہ تھیوری کی حدوں سے گزر کے عمل کے مرحلہ میں داخل ہوچکا ہے اور اب بتدریج بہت سے ممالک کے سائنس دانوں نے ضدِ مادہ عناصر کو دریافت کرلیا ہے۔

مادہ اور ضدہ مادہ عناصر کے درمیان فرق یہ ہے کہ مادہ کے ایٹم کے الیکٹرون کا برقی بار منفی ہوتا ہے اور پروٹون کا برقی بار مثبت ہوتا ہے۔ لیکن ضدِ مادہ کا ایٹم اس کے برعکس ہے۔ اس کے الیکٹرون کا برقی بار مثبت اور پروٹون کا برقی بار منفی ہوتا ہے۔

اب تک کہیں اس بات کا تجربہ نہیں ہوا ہے کہ جب مادہ کے ایٹم اور ضدِ مادہ کے ایٹم کا ٹکراؤ ہو اور دھماکہ وجود میں آئے تو کیا ہوگا۔

جو کچھ اس دھماکہ کے بارے میں کہا گیا ہے وہ تھیوری کی حد تک ہے اور اسی کی مانند ہے جیسا کہ یورینیم کے ایٹم کے بارے میں اس سے قبل کہا جاتا تھا کہ جب ابھی ۱۹۴۴ء کی گرمیوں سے قبل امریکہ نے اپنے اوّلین ایٹم بم کی آزمائش نہیں کی تھی۔

اس وقت کہا جاتا تھا کہ ممکن ہے کہ ایٹم بم کی آزمائش کے بعد کرۂ زمین پر موجود تمام عناصر بکھر جائیں اور ان کے اتصال کی زنجیر ٹوٹ جائے لیکن ایسا نہ ہوا اور گو کہ اس کے بعد بھی بارہا ایٹمی دھماکے کئے گئے اور ہائیڈروجن بم کی آزمائش کی گئی تب بھی کرۂ خاکی کے عناصر منتشر نہیں ہوئے۔

لیکن ایٹم بم کے دھماکے اور مادہ اور ضدِ مادہ کے تصادم کے درمیان فرق ہے کیونکہ جب ایک ایٹم یا ہائیڈروجن بم پھٹتا ہے تو مادّہ کا بہت تھوڑا سا حصّہ انرجی میں تبدیل ہوتا ہے اور مادہ کا زیادہ حصہ بے کار رہ جاتا ہے یعنی انرجی میں تبدیل نہیں ہوتا۔

سب ہی جانتے ہیں کہ مادہ کے انرجی میں تبدیل ہونے کا قانون جو آئن اسٹائن نے دریافت کیا یہ ہے کہ۔

انرجی مساوی ہے حجم ضرب روشنی کی رفتار کے دگنے کے ۔

اس قانون کے مطابق وہ سب کچھ جو ایک ایٹم یا ہائیڈروجن بم کے اندر موجود ہے انرجی میں تبدیل ہوجائے تو ایک بڑی طاقت وجود میں آئے گی۔

انیسویں صدی کے انگریز ماہرِ طبیعیات ژول کے بقول اگر ایک کلو مادہ مکمل طور پر انرجی میں تبدیل ہوجائے تو دنیا نابود ہوجائے۔ لیکن بیسویں صدی میں آئن اسٹائن نے مادہ کے انرجی میں تبدیل ہونے کے قانون کی دریافت کے ذریعہ بتایا کہ ایسا نہیں اور خواہ ایک کلوگرام مادہ مکمل طور پر انرجی میں تبدیل ہوجائے تب بھی کائنات نابود نہیں ہوگی لیکن اب تک نوعِ بشر حتیٰ ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے ذریعہ بھی مادہ کو مکمل طور پر انرجی میں تبدیل نہیں کرسکی ہے۔

اگست ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کے ایک ہزار حصوں میں محض ۱۹ حصے انرجی میں تبدیل ہوئے اور بقیہ ضائع ہوگئے۔

ہائیڈروجن بم کے مادہ کے انرجی میں تبدیل ہونے کے حساب سے ہم ناواقف ہیں اور وہ ممالک جن کے پاس یہ بم ہیں اور جنھوں نے اس کا تجربہ کیا ہے انھوں نے نہیں بتایا کہ اس کا کتنا حصہ انرجی میں تبدیل ہوا ہے کہ ہم جان سکتے کہ اس کا کتنا حصہ تلف

ہوا ہے۔ ان ممالک کی یہ خاموشی اپنے دفاعی رازوں کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت کی بناء پر ہے۔

اس کے باوجود کہ آئن اسٹائن کا قانون ظاہر کرتا ہے کہ اگر ایک یا چند کلو مادہ مکمل طور پر انرجی میں تبدیل ہوجائے تب بھی زمین نابود نہ ہوگی۔ ۱۹۴۴ء میں جب امریکی سائنس دانوں نے ایٹم بم کا تجربہ کرنا چاہا تو وہ خوفزدہ تھے کہ کہیں اس کی وجہ سے کرۂ ارض نابود نہ ہوجائے۔

آج بھی جب کہ طبیعیات میں مادہ اور ضدِ مادہ کے تصادم پر بحث ہوتی ہے تو طبیعیات کے یہی سائنس دان کہتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں یہ دونوں مکمل طور پر انرجی میں تبدیل ہوجائیں گے۔

ان سائنس دانوں کے بقول ایک کلوگرام مادہ اور اتنے ہی ضدِ مادہ کے تصادم سے اس قدر انرجی پیدا ہوگی کہ کرۂ ارضی معدوم یعنی گیس میں تبدیل ہوجائے گا اور کیونکہ ان گیسوں کی حرارت بہت زیادہ ہوگی اس لئے ہمارا شمسی نظام تہ و بالا ہوجائے گا۔

لیکن پروفیسر الفن جو اس وقت سوئیڈن کی لونڈ یونیورسٹی کے شعبہ طبیعیات کے استاد ہیں اس نظریہ کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ نوعِ بشر کے لئے مستقبل کی توانائی کا منبع نہ برق پیدا کرنے والے کارخانوں میں یورینیم کی افزودگی ہے نہ ہائیڈروجن بلکہ نوعِ بشر مستقبل میں مادہ اور ضدِ مادہ کے تصادم کے ذریعہ توانائی حاصل کرے گی اور ان عناصر کا ۱۰۰ کلوگرام یعنی ۵۰ کلوگرام ضد مادہ اور ۵۰ کلوگرام مادہ' کرہ ارض پر بسنے والے تمام نوعِ بشر کی ایک سال کی توانائی کی تمام ضروریات کے لئے کافی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا کہ ابھی تک مادہ اور ضدِ مادہ کو ٹکراؤ کے ذریعہ پھاڑا نہیں گیا ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ اس سے کیا حاصل ہوتا ہے لیکن پروفیسر الفن' مادہ اور ضدِ مادہ کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی طاقت کو انرجی جو مادہ سے حاصل ہونے والی معمولی قوت ہے کے مقابل ماتر ژی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس دانشور کے نظریہ کے مطابق اگر آدھا کلوگرام مادہ اور آدھا کلوگرام ضدِ مادہ کا

ٹکراؤ ہوجائے تو ایک سو ملیارڈ درجہ (ایک سو ہزار ملین درجہ) حرارت وجود میں آئے گی اور یہ اس قدر حرارت ہے کہ کائنات میں اتنی حرارت پیدا کرنے والا کوئی منبع نہیں۔

ستاروں کی طبیعیات سے واقف سائنس دانوں کے نزدیک سورج کے مرکز کی حرارت دس ملین درجہ ہے۔

کیا نوعِ بشر اس قدر زیادہ حرارت کو کنٹرول کرکے اپنے استفادہ میں استعمال کرسکتی ہے؟

پروفیسر الفن کہتا ہے کہ مادہ اور ضدِ مادہ کا ناقص دھماکہ میزانِ حرارت کو بہت کم کرسکتا ہے۔ ناقص دھماکہ سے اس کی مراد ایٹم بم کے دھماکہ جیسا دھماکہ ہے کہ جس میں مادہ کی ایک معمولی سی مقدار انرجی میں تبدیل ہوتی ہے اور بقیہ ضائع ہوجاتی ہے۔

مادہ اور ضدِ مادہ کا تصادم محض تھیوری سے آگے نہ بڑھنے کی وجہ اقتصادی ہے۔ کیونکہ پروفیسر الفن کے مطابق مادہ اور ضد مادہ کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں توانائی کے حصول کے صرف تجربہ ہی کے لئے دس سے پندرہ ملیارڈ ڈالرز کی ضرورت ہے اور آج کوئی حکومت اور کوئی ادارہ ایسا نہیں جو اس قدر رقم خرچ کرسکے۔

تجربہ سے ظاہر ہے کہ آزمائشی مرحلہ طے ہونے کے بعد مادہ اور ضد مادہ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ماترژی کا حصول آسان ہوجائے گا۔

جیسا کہ ایٹمی طاقت سے استفادہ کے وقت تمام عناصر میں سے یورینیم کا انتخاب کیا گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مادہ اور ضدِ مادہ کے دھماکہ سے استفادہ کے لئے ہیلیم سے استفادہ کیا جائے گا۔ کیونکہ روسی ماہرینِ طبیعیات نے ہیلیم کے ضدِ مادہ کو دریافت کرلیا ہے۔ اور ساتھ ہی روس میں مادہ اور ہیلیم کے ضدِ مادہ کے دھماکہ کے مقدمات فراہم ہیں اور ہمارے خیال میں اس کام کی اہمیت کے بارے میں بحث ضروری نہیں۔

---☆---☆---